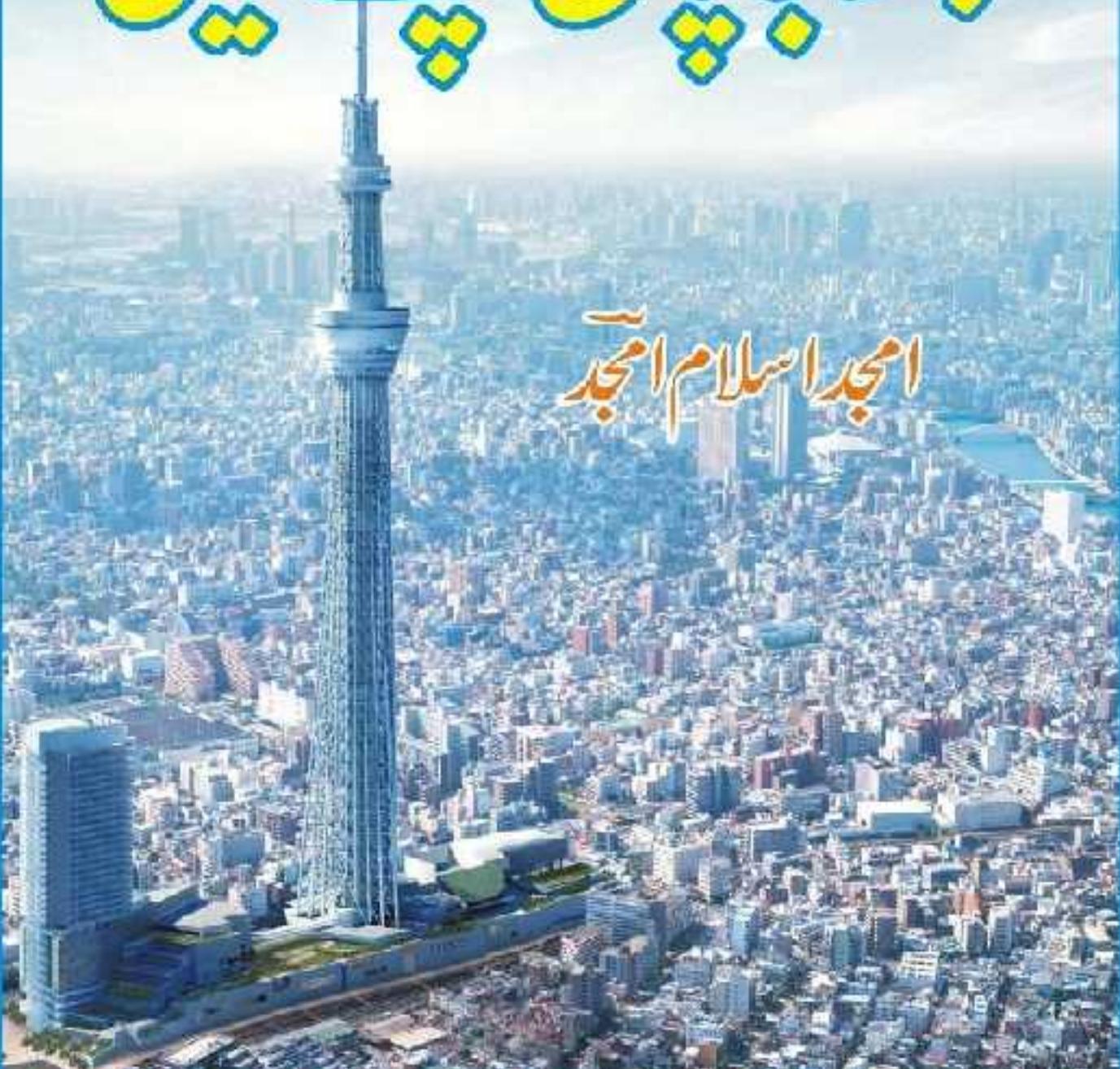


سفرنامہ

چڑھاں پلے ہیں

امجد اسلام امجد



چلو جا پان چلتے ہیں

چند دن قبل جب نوجوان شاعر عامر بن علی کا نوکیو سے فون آیا کہ وہاں کی تین یونیورسٹیاں (جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے) اور پاکستان جا پان حلقة ادب و ثقافت مل کر کچھ تقریبات کا اہتمام کر رہے ہیں جن میں مجھے بھی آنا ہو گا تو میرا پہلا روئیل سراسر حیرت پر منی تھی کیونکہ دو چار کو چھوڑ کر میرے سارے غیر ملکی سفر مشاعروں کے حوالے سے ہی ہوئے ہیں اور اگرچہ جا پانی حضرات بات بات پر فرشی سلام کے انداز میں بار بار جھکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے "مطلع عرض ہے" اور "مکر ارشاد" سننے کی دو روزہ تک موقع نہیں تھی۔

یوں بھی فی الوقت میں امریکہ، کینیڈا، ناروے اور بھارت کی مختلف وعوتوں سے محدثت کی کارروائیوں میں الجھا ہوا تھا کہ تدریس سے انتظامی عہدوں پر آنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ موسم گرم کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں جن میں طویل مدت کے لیے ہیرون ملک سفر کرنے کی گنجائش نکل آتی تھی۔ میں نے عامر بن علی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو اس نے یہ کہہ کر بات ہنسی میں ٹال دی کہ آنے والے کے وقت سمیت سارا پروگرام سات دن پر مشتمل ہے اور جا پان یقیناً اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔

گزشتہ برسوں میں ہمارے تین نزدیکی احباب جا پان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دے چکے ہیں یعنی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر نجم کاشمیری اور ڈاکٹر سعید احمد خان۔۔۔۔۔ اور تینوں ہی کی زبان سے میں نے جا پان کے بارے میں ہمیشہ کلمہ خیر ہی سناتھا۔ یوں بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد جا پان کی صنعتی ترقی کی رفتار اس کا ایک دنیا بھی کے میدان میں اس کی جادو گریاں اسی ہیں کہ بے اختیار دل اس ملک اور اس کے لوگوں کو ان کے گھر میں دیکھنے کو چاہتا ہے کہ یہ قوم آج کی دنیا میں ایک زندہ مجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

معلوم ہوا کہ شروع میں صرف مجھے اور عطا احمد قاسمی کو بلانے کا پروگرام تھا مگر اب محمود شام اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی ہمارے ساتھ ہم سفر ہوں گے تاکہ شاعری، طنز و مزاح، صحافت اور اقبالیات چاروں شعبوں کا احاطہ کیا جاسکے۔ قارن آفس کے جا پان ڈیک سے متعلق افسران اسد گیلانی اور آفتاب احمد کی خصوصی دلچسپی اور کوشش سے ویزوں کے حصول کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو گیا اور ٹੇ پایا کہ ۹ جون کو ہم سب نوکیو کے لیے براستہ بنکا ک روائہ ہوں گے لیکن اس دوران میں ایک واقعہ یہاں اور ایک وہاں رومنا ہوا یعنی ہمارے گروپ میں سے رفیع الدین ہاشمی علامت کی وجہ سے ڈرپ ہو گئے اور دوسری طرف جا پان کی وزارت خارجہ نے ہم لوگوں کو مزید ایک بختے کے لیے اپنا مہماں بنانے کا پر جوش ارادہ ظاہر کیا۔ ایسی اچھی دعوت سے انکار کرنا یقیناً کفران نعمت سے کم نہیں۔ لیکن صورت حال کچھا ایسی ہے

کہ ہم تینوں ہی اپنی اپنی مختلف وجوہات کے باعث اتنا عرصہ وہاں نہیں رک سکتے۔ سوتا دم تحریر اس بات پر سوچ بچار ہو رہا ہے کہ کس طرح اس معاملے کو سات کے چودہ دن تک بڑھانے کی بجائے نو یا دس دن میں اس طرح سیمائیا جائے کہ ملے شدہ پروگرام کے بعد کچھ دن وزارت خارجہ کے لیے بھی نکل آئیں۔ بہر حال جو بھی فیصلہ ہوا آپ کو اس کی اطلاع آئندہ کسی کالم میں مل جائے گی کہ میرا ارادہ اس سفر کے تاثرات کو ساتھ ساتھ قلم بند کرنے کا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ سفر ناموں کے اس جمعہ بازاری دور میں بھی جاپان کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ جو تحریریں حافظے میں موجود ہیں ان میں قابل ذکر نام ابن انشاء اختر ریاض الدین، حکیم محمد سعید اور ہمارے گریز پا جمزوہ ہم سفر رفیع الدین شاہ ہاشمی کے ہی ہیں۔ جاپانیوں کی عقل مندی اور دوراندیشی کی وادوئی چاہیے کہ انہوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں ہی اپنی یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی تعلیم کے شعبے قائم کر دیئے تھے جو آئندہ چل کر ان کی مصنوعات کی منڈیاں بننے والے تھے۔ تین یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کا اہتمام بھی اسی پروگرام کا حصہ ہے۔

چینیوں کی طرح جاپانیوں کے نام بھی آپس میں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ زیر زبر پیش یا کسی حرف پر زور دینے سے بظاہر ایک جیسے نظر آنے والے نام کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ سو ہوایوں کہ میں نے عامر بن علی کے باتحف غلام عباس پر پی ایچ ڈی کرنے والے جاپانی دوست سویمانے کو اپنی ایک کتاب بھجوائی اور سنگ میل چبلی کیشنز کے برادرم افضل احمد سے اس کا موجودہ ٹیلی فون نمبر حاصل کیا تاکہ عامراں سے فون پر رابطہ کر کے اس کا وہ پتہ حاصل کرے جس پر کتاب اسے مل جائے سب کچھ اسی طرح ہوا مگر وہ کتاب کسی اور سویمانے کو پہنچ گئی جو اردو کی شد بد تور کھتا تھا لیکن اس کا شعبہ عمرانیات ہے جس کے سلسلے میں وہ پاکستان آتا رہتا ہے اور غالباً افضل نے غلطی سے مجھے اس کا فون نمبر دے دیا تھا۔

جاپان کی مہنگائی، خوبصورتی اور ترقی کے قصے وہ لوگ بھی انتہائی اعتقاد سے سناتے ہیں جنہوں نے آج تک جاپان کی سر زمین پر قدم بھی نہیں رکھا۔ اب یہ کام ٹو ٹوی ائر نیٹ یاد نیا کے گلوبل ویچ کی شکل میں سکون نے دکھایا ہے یا اس سنی سنائی کا شاخانہ ہے جس سے ہم افواہ کو حقیقت کا رنگ دے دیتے ہیں اس کا جواب تو میں آپ کو ”سفید گھوڑا“ دیکھ کر ہی دے سکوں گا۔

جن قارئین کو سفید گھوڑے کے پس منظر سے آگاہی نہیں ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک بزرگوار اپنے پوتے کے ساتھ ایک سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے جہاں تماشا یوں کا جھوم تھا اور تکشیں بلیک ہو رہی تھیں۔ دادا کے استفسار پر پوتے نے جھوکتے اور شرماتے ہوئے بتایا کہ اس فلم میں ہیر و سین بغیر کوئی کپڑا اپنے ایک سفید گھوڑے پر سواری کرتی دکھائی گئی ہے اور اسی سین کی وجہ سے یہ فلم اتنا راش لے رہی ہے۔

بزرگوار نے چند لمحے تھکر کیا، پھر بولے۔

”آؤ، ہم بھی یہ فلم دیکھتے ہیں کیونکہ میں نے بہت دنوں سے کوئی سفید گھوڑا نہیں دیکھا۔“

سوہم بھی جاپان چلتے ہیں کیونکہ ایک دوست کے بقول ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ جاپان میں گھوڑتے ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔

ٹو کیو براستہ بنکاک

۱۹ اور ۲۰ جون کی درمیانی رات کو تھائی ائر کی فلاہیٹ نمبر T.G.506 قبیل میں سوار ہوتے وقت مجھے اپنا شاعر دوست فیصل عجی بہت یاد آیا کہ تقریباً چودہ برس قبیل میں نے بنکاک کا پہلا سفر اسی کی دعوت پر کیا تھا۔ فیصل گزشتہ دو سال سے نامعلوم و جوہات کی بنا پر سین سے غائب ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کی عمدہ شاعری، رسالہ ”آثار“ اور ادب اور ادیبوں کے سلسلے میں کئے گئے بہت سے اچھے کاموں کو بھول کر اس کے سین سے غائب ہونے کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کی بنیاد صرف اور صرف افواہوں پر ہے۔ میں اس کے کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ادب اور ادیبوں کی حد تک اس نے کچھ نہ کچھ دیا ہی ہے، لیا نہیں۔

اس بات کا میرے موجودہ دورہ جاپان سے اگرچہ کوئی براہ راست تعلق نہیں لیکن چونکہ میں اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا سو آج کر دیا کہ کسی کی اچھائی کی تعریف نہ کرنا اور بہتان تراثی ہمارے معاشرے کا عمومی مزاج بُختی جا رہی ہے جو یقیناً کوئی ثابت روئی نہیں ہے۔ جیسا کہ میں آپ کو گزشتہ کالم میں بتاچکا ہوں۔ یہ تین رکنی ادبی دورہ پاکستان جاپان دوستی کی تنظیم کے شعبہ اردو و ثقافت کی طرف سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں مشاعروں کے ساتھ جاپان کی تین ایسی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں شامل ہیں جہاں اردو زبان بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔

لاہور سے بنکاک تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کی فلاہیٹ ہے اس میں ٹائم ڈفرنس کے دو گھنٹے شامل کر کے میں اور عطاۓ الحق قاسمی بنکاک کے وقت کے مطابق صحیح ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچے۔ ہمارے تیرے ساتھی مشہور صحافی اور شاعر محمود شام ہم سے پہلے کراچی سے بنکاک پہنچ چکے ہیں۔ ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جس وقت جزل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا، عطاۓ الحق قاسمی تھائی لینڈ میں پاکستان کے سفیر کے طور پر نیازیا آیا تھا اس نے بتایا کہ اس نے ان دنوں پاکستان سے کچھ مشاعروں کو مددوکر کے ایک عدد مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور صورت حال یہ تھی کہ مہمان اور میزبان دنوں کو پہنچنے میں چل رہا تھا کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔

بنکاک ائر پورٹ پر ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے رکنا تھا۔ ٹرانزٹ لاوچ میں اس وقت زیادہ تعداد پاکستانی اور ہندوستانی مسافروں کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے ٹرانزٹ لاوچ جمعہ بازار کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہ لوگ بھی ٹرانسفر ڈیسکوں کے سامنے جگھٹا سا لگائے ایک دوسرے سے

آگے نکلنے کی کوششیں کر رہے تھے جن کی فلاںٹوں میں ابھی کئی گھنٹوں کا وقت تھا۔ عطا نے دو تین لوگوں کو روک کر اس جگہ کا پتہ معلوم کیا جہاں سگریٹ پینے کی اجازت تھی۔ معلوم ہوا کہ مقامی انتظامیہ نے اس کے لیے کچھ کہن بنار کئے تھے جن میں بینچ کر لوگ ایسے خصوصی و خشوع سے سگریٹ پینے ہیں جیسے کوئی عبادت کر رہے ہوں۔

عزیزی عامر بن علی نے فون پر بتایا کہ بنکاک ائیرپورٹ پر آپ کو بہت اچھے مساج پارلرzel جائیں گے جہاں بہت شریفانہ فضا اور ماہر انداز میں مسافروں کی تھکن دور کی جاتی ہے۔ ہمیں گیٹ نمبر گیارہ سے اپنے جہاز پر سوار ہونا تھا اسی کے راستے میں مساج پارلر تھا۔ مختلف مساجوں کی نوعیت اور ان کی فیس انگریزی اور تھائی دونوں زبانوں میں درج تھی۔ کندھوں اور پاؤں کے ۲۵ مٹ کے مساج کا ریٹ ۵۰۰ مقامی با تھا یعنی ۱۵ امریکی ڈالر تھے جو یقیناً براسو اُنہیں تھا کہ رات کے جگراتے اور فلاہیت کی تھکن دونوں کا احساس ختم ہو گیا۔ گزشتہ چند برسوں سے شوگر کی وجہ سے میرے پاؤں کی انگلیاں جزوی پر سن رہتی ہیں، وقت طور پر ہی کہی، لیکن یوں لگا جیسے پاؤں کی سوئی ہوئی رگوں میں زندگی جاگ پڑی ہو۔ چنانچہ ہم دونوں نے دوران مساج ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ واپسی پر پھر اسی تجربے کو دوہرائیں گے۔

فلاہیت کا کھانا اس بار پہلے سے بھی بد مردہ تھا۔ میں طبعاً گوشت خور نہیں ہوں اور مچھلی بھی نہیں کھاتا اور سفر میں مجھے اکثر اس باب میں پریشانی رہتی ہے سو میں نے بن اور کافی پر اکتفا کیا اور سونے کی کوشش کی کیونکہ سامنے سکرین پر چلنے والی فلم بھی انتہائی بور تھی۔ جہاز خاصاً بڑا اور نیازیاً تھا البتہ ایکر ہو سٹوں کا انتخاب بقول عطا اس احتیاط سے کیا گیا تھا کہ اہل ایمان کو کسی امتحان سے نہ گزرننا پڑے۔ جاپانی وقت کے مطابق ہم مقررہ وقت سے پانچ منٹ قبل نو کیوں چکنچ گئے۔ امیگریشن کے پندرہ بیس کا ڈنر ز میں سے صرف ایک آباد تھا۔ کبھی میں نہیں آیا کہ اتنے بڑے اور مصروف ہوائی اڈے پر ”کوئی ویرانی سی ویرانی ہے“ کا سیٹ کیوں لگایا گیا تھا۔ اتفاق سے ہم لائن کے ابتدائی حصے میں تھے سو جلدی ہی باری آگئی ہم سے پہلے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی آفیسر نے مسافر کیسٹر کرنے میں بڑی پھر تی وکھائی تھی لیکن ہمارا پاسپورٹ شاید اسے زیادہ پسند آگیا تھا۔ کیونکہ وہ بار بار کبھی ہمیں کبھی پاسپورٹ کو اور کبھی پیسوڑ کی سکرین کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس کے ساتھ دو لے کاؤنٹر پر ایک پتلا دبلا سائز کا بینچ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جاپانی میں کچھ کہا اور پھر ہمارے بھرے ہوئے امیگریشن قارم کا جائزہ لینے لگی اچانک کسی طرف سے ایک نسبتاً دراز قد اور خوش شکل ہی لڑکی نمودار ہوئی۔ دونوں نے ہمارے پاسپورٹ اس کے حوالے کے اس سارے عمل کے دوران تینوں کے چہروں کی مسکراہٹ میں ذرہ برابر کی نہیں آئی۔

نووارد حسین نے جو اپنی وردی سے کوئی سینٹر افسر لگ رہی تھی ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی باہمیں طرف واقع ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور پہلے سے بھی زیادہ دوستانہ مسکراہٹ سے گویا ہوئی کہ آپ لوگ یہاں کس مقصد سے تشریف لائے ہیں اور یہ کہ آپ کے میزبان کون ہیں اور آپ کو کہاں پھر رہائیں گے۔ میں نے سن کھا تھا کہ جاپانی لوگ اساتذہ اور پروفیسرز کی بہت عزت

کرتے ہیں چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ پروفیسر ہیں اور تمین جاپانی یونیورسٹیوں کی مشترکہ دعوت پر آئے ہیں اور متعلقہ دعوت نامہ ہمارے سامان میں موجود ہے اور پوچھا کر آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس پر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں، آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں بھی آتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے دونوں پاسپورٹ ایک مخصوص لغافے میں ڈالے اور ایک تیرے دروازے سے باہر نکل گئی اس دوران میں چھ سات خواتین و حضرات جو صورت سے لاطینی امریکہ کے باشندے لگتے تھے کچھ گھبراۓ گھبراۓ سے کرے میں داخل ہوئے اور ہمارے ارد گرد بیٹھ گئے ان کی خاموشی اور پریشانی طرح طرح کے اندیشوں کو جنم دے رہی تھی تقریباً پانچ منٹ بعد (جو اس وقت پانچ گھنٹوں سے بھی طویل گے) وہ اسی انتہائی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک اور دروازے سے اندر آئی اور انگریزی سے ملتی جلتی ایک زبان میں ہم سے مغدرت کی کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا اور پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے اور میں اس پوائنٹ تک چھوڑنے آئی جہاں سے ہم اپنا سامان لینے کے لیے متعلقہ ہال میں داخل ہو سکتے تھے ایسی ٹینش بھری صورت حال کا یہ انجام سکون بخش ہونے کے باوجود اتنا غیر متوقع تھا کہ کتنی دیر تک ہم بھی سوچتے رہے کہ یہ قوم کیسی انسان دوست اور تہذیب یافتہ ہے۔ باہر نکلے تو عزیز عامر بن علی اور اس کے بڑے بھائی عبدالحسین سراپا انتظار کھڑے تھے۔ ہم نے انہیں تاخیر کی وجہ اور امیگریشن افسران کی خوش اخلاقی کی روادوستائی تو دونوں یک زبان ہو کر بولے کہ عاجزی انکساری اور خوش اخلاقی میں جاپانی قوم کا مقابلہ صرف جاپانی قوم ہی کر سکتی ہے۔

ٹوکیو میں پہلی شام

جب ایک پورٹ سے نکلے آدھا گھنٹہ ہو گیا تو باتوں میں پڑا چلا کہ ٹوکیو شہر بھی مزید آدھا گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور دو دروڑ تک پھیلا ہوا ہے کہ میں کئی "ضمنی" شہر بھی اس طرح شامل ہیں کہ من تو شدم تو من شدی کا سامعاملہ ہے اور یہ کہ فی الوقت ہم کچھ دوستوں کی فرمائش پر ایک مسجد میں جا رہے ہیں جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم کا بھی اہتمام ہے۔ "مسجد حرام" کے نام سے یہ چھوٹی سی مسجد ایک تین منزلہ عمارت میں قائم تھی اور ہر منزل پر ایک ہی کرہ تھا جس میں چالیس پچاس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ گروئنڈ فلور پر خواتین کے لیے نماز کا انتظام تھا اور باقی دو منزلوں پر مرد حضرات یہ فرض ادا کرتے تھے۔ دراصل یہ ایک رہائشی عمارت تھی جس کی چھت پر دو چھوٹے چھوٹے بینار تعمیر کر کے اسے مسجد کی شکل دے دی گئی تھی۔

جس وقت ہم وہاں پہنچنے نماز ختم ہونے کے قریب تھی۔ ہمارے میزبان پاکستان جاپان ایسوی ایشن کے جزل سیکرٹری ملک جبیب الرحمن ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ ان کی عمر تو لگ بھگ ۶۲ سال تھی لیکن آواز سے وہ ۸۰ برس کے لگتے تھے۔ یہ بات اس لیے بھی حیرت انگیز تھی کہ طبیعت کے اعتبار سے وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے اور عام طور پر ایسے لوگوں کی آواز ان کی عمر کی نسبت زیادہ جوان

ہوتی ہے۔

نشست کا انتظام دوسری منزل پر تھا، ایک اعتبار سے اچھا لگا کہ ہمارے دورے کا آغاز ایک بارگات جگہ سے ہو رہا تھا۔ لیکن مذہبی معاملات کے بارے میں وہاں پر موجود احباب کا عمومی روایہ کچھ زیادہ حوصلہ افرانہ تھا کہ اسی ترقی یافتہ اور سماجی اعتبار سے مسلمان سوسائٹی میں رہنے کے باوجود ان کا رجحان "معاملات" کی بجائے "عبادات" کی طرف زیادہ تھا اگرچہ یہ ہمارا قومی مزاج ہے کہ ہم نیکیاں کمانے کے بجائے انہیں گنتے پر زیادہ زور دیتے ہیں اور یوں ہمارا اللہ سے تعلق بندگی سے زیادہ "کار و بار" کا سارہ تھا ہے لیکن یہ بات بہر حال خوش آئند تھی کہ اتنی مختصر اور جاپان بھر میں منتشر کیوں ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنے قومی اور مذہبی شخص کو قائم کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ پورے جاپان میں رجسٹرڈ پاکستانیوں کی تعداد صرف ۸۶۰۰ ہے۔

خلافت کلام پاک درس حدیث اور ہم تینوں مہماں کے اظہار خیال کے بعد سوال و جواب کی ایک مختصر نشست ہوئی جس کے دوران معلوم ہوا کہ وہاں کی حکومت اور عوام کسی کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتے اور لوگ اپنے اپنے اعتقادات کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہیں۔ اس کے بعد روايتی لنگر کا کھانا ہوا جو تان اور قورے پر مشتمل تھا مگر بہت پر لطف اور ذائقے دار تھا جس کی ایک وجہ ہماری بھوک کی شدت اور جہاز کے کھانوں کی بد مزگی بھی ہو سکتی ہے، لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔

ہمارا ہوٹل Mitsul Garden کھاتا کے علاقے میں تھا جوڑاون ٹاؤن یعنی پرانے شہر میں واقع ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ہوٹل کے ارد گرد بہت سے نائنٹ کلب ہیں اور یوں اسے "بازارِ حسن" بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے منتظرین کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا کہ ہمارے کردار کے بارے میں ایسی فلطا اور منفی رپورٹ انہوں نے کہاں سے حاصل کی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ہماری تشغیل کر دی کہ ان کی ایسوی ایشناں کا دفتر ہوٹل سے صرف دو گزر کے فاصلے پر ہے اور اس جگہ کا انتخاب انتقامی سہولتوں کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

میرے حصے میں کمرہ نمبر ۹۱۱ آیا جواب نائنٹ ایلوں کے حوالے سے ایک جدا گانہ معانی کا حامل بن چکا ہے اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار ڈیرہ غازی خان میں مجھے اور انور مسعود کو جو کمرہ ملا تھا اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ اسی کمرے سے ایک کانی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ کمرہ معقول درجے کے تمام رہائشی تقاضوں کو پورا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے اپنے درمیانے درجے کا اٹپچی کیس رکھنے کے لیے کافی تھا و دو کرنا پڑی کہ بیگ رکھنے کے بعد کمرے میں کھڑے ہونے کے لیے جگہ پیدا کرنا بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ اس وقت مجھے شفیق الرحمن کا بلبل کے بارے میں لکھا ہوا ایک جملہ بہت یاد آیا۔ اپنے ایک مضمون "ملکی پرندے و دیگر جانور" میں وہ کہتے ہیں۔

"بلبل پرول سمیت محض چند اچھے لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پر نکال دیئے جائیں تو کچھ زیادہ بلبل باقی نہیں بچتی۔"

حکومت پاکستان کے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ وہ پڑوں کی ہوش را گرانی کے جواب میں جاپان کی مثال بھی دے سکتی ہے جہاں

پڑوں پا کستانی کرنی کے مطابق ۲۸ روپے فی لتر ہے بس اتنی احتیاط کرنا ہوگی کہ عوام کو جا پانیوں کی فی کس سالانہ آمدنی کا پتہ نہ چلنے پائے۔ ہوٹل کے عملے کی انگریزی اس قدر کمزور تھی کہ ہم سب ان کے مقابلے میں ”اہل زبان“ لگ رہے تھے۔ اس قدر امریکی اثر کے باوجود جا پانیوں کی انگریزی زبان سے یہ بے اعتنائی سمجھے سے باہر تھی۔ یہ مسئلہ کسی حد تک عزیزی مظہر دانش نے حل کیا۔ مجھے یہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا کہ مظہر دانش سے ہماری ملاقات ہوٹل کے لاڈنچ میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ بہت دیر سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا اس سے ٹیلی فون پر رابطہ تو گزشتہ ایک ماہ میں کئی بار ہوا کہ ہماری آمد کے انتظامات وہ اور عامر بن علی مل کر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ چند برس قبل پنجاب یونیورسٹی کے رسالہ ”محور“ کے حوالے سے مجھ سے امتحان یوں چکا ہے۔ دانش کے بارے میں باقی ہوتی رہیں گی کہ یہ نوجوان اس کے بعد ہماری جاپان سے ”رخصتی“ تک ہر جگہ ہمارے ساتھ رہا اور اس کی محبت، عقیدت اور گرم جوشی نے ہمیں سارے سفر میں شاد اور سرشار رکھا۔ اس نے بتایا کہ جب امریکی فوجوں نے جاپان پر قبضہ کر لیا تو بادشاہ نے جو واحد فرمانش ان سے کی وہ یہی تھی کہ اور جو چاہو کرو مگر، ہم سے ہماری زبان نہ چھینتا۔ سو آج بھی جاپان میں ذریعہ تعلیم ان کی اپنی زبان ہے اور ان کا ایک محدود اور مختلف طبقہ ہی انگریزی زبان سیکھتا ہے مگر صرف ”کام چلاو“ حد تک ہماری طرح نہیں کہ جہاں پڑھے لکھے ہونے کی واحد نشانی صرف اور صرف انگریزی ہے اور بقول مشاق احمد یوسفی ہمارے یورو کریٹ صحیح اردو پر غلط انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ ہماری نئی انگلش میڈیم نسل تو چھینکتی بھی انگریزی میں ہے اس کے نزدیک ”آڈچ“ کے بعد ”الحمد لله“ کے بجائے ”ایکسیو زمی“ کہنا چاہیے کہ ایسی معدودت طلب بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا بڑی جہالت کی بات ہے۔

معلوم ہوا کہ برادرم ڈاکٹر خراحت نوری جو آج کل اوسا کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں، پہنچ چکے ہیں اور اس وقت اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے ہزارے لے رہے ہیں۔ نوری گزشتہ کئی رسوم سے میری اور عطااء کی ماوراء علمی اور پیش کالج میں پڑھار ہے تھے اور اب تقریباً ایک برس سے برادرم ڈاکٹر قبسم کاشمیری کی غالی کی ہوئی جگہ پر کام کر رہے ہیں اگرچہ پاکستانی یونیورسٹیوں سے کئی ایک اساتذہ نے جاپان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے ہیں مگر ڈاکٹر قبسم کاشمیری کی والیگی کا دورانیہ کم و بیش ۲۲ برس پر محیط ہے جو اپنی جگہ پر ایک ریکارڈ ہے۔

ملک جبیب الرحمن اپنی تھکی ہوئی آواز میں فر فر جا پانی بول کر ہمارے ہوٹل میں چیک ان ہونے کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ باہر سڑک پر بلکل بلکل بارش میں اکا دکا مردوزن چھتریاں لیے جیسے نیند میں چل رہے تھے (ممکن ہے وہ ٹھیک ہی چل رہے ہوں اور نیند ہماری آنکھوں میں ہو کہ رات کے دونج رہے تھے) ایک بزرگ صورت جا پانی ہوٹل کے صدر دروازے پر آیا اس نے چھتری بند کی اور دروازے پر کھے ایک شینڈ میں سے ایک پلاسٹک کا کور اتار کر اس پر لپیٹا اور کورٹش بجالانے کے مخصوص جا پانی انداز میں ہمارے قریب

سے بار بار جھلتا ہوا استقبالیہ کا ونگر کی طرف چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ جاپان میں بارشیں چونکہ بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لیے چھڑیوں کے لیے پلٹنک کو روز دروازوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ پانی باہرنے کے بعد میں پتہ چلا کہ جاپانی اپنے آنسو بھی باہرنہیں گرنے دیتے۔

ٹوکیو میں مشاعرہ

۱۱ جون ۲۰۰۶ء اس اعتبار سے ایک تاریخی دن ہے کہ اس روز جاپان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا اردو مشاعرہ ہوا جس میں بیک وقت چار صاحب دیوان شاعروں نے شرکت کی۔ تفصیل اس اجھاں کی یہ ہے کہ پاکستان جاپان ایسوی ایشن نے اتوار کے دن گیارہ بجے صحیح ہماری قیام گاہ یعنی Mitsul Garden ہوٹل ہی کے ایک ہال میں مذاکرے اور مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا میں نے صحیح دس بجے استقبالیہ پر فون کر کے پوچھا کہ ناشتے کی کیا پوزیشن ہے تو جواب ملا کہ ہم ساڑھے نوبجے کے بعد کمروں سے ناشتے کا آرڈر نہیں لیتے اور بوفے کا ہمارے یہاں روان ج نہیں۔ میں نے پوچھا، ریسٹوران تو کھلا ہو گا ہم لوگ نیچے آ کر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ اس پر دوسرا طرف کی انگریزی ختم ہو گئی اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہے گئے جن سے یہ مفہوم نکالا جا سکتا تھا کہ میں ابھی پتہ کر کے بتاتی ہوں۔

پانچ چھ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک خوش قامت اور قدرے سینٹر دھکائی دینے والے ہوٹل کے نمائندے نے اپنی شکستہ ترا انگریزی میں دریافت کیا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے صرف دونوں دو اندھوں کا آمیٹ اور ایک عدد چائے کا کپ چاہیے۔ اس شریف آدمی نے تینوں فرمائشوں کے جواب میں فتحی میں سر ہلایا اور جو کہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم ایسی خرافات میں لیکھنے نہیں رکھتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں نوناچھلی کا سینڈوچ یا مچھلی کے شوربے میں بنی ہوئی نوڈلز بازار سے لا کر دے سکتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سی فوڈ نہیں کھاتا اور یہاں کے چکن کے سلسلے میں میرے کچھ تحفظات ہیں اس لیے تم اگر آمیٹ اور نوٹ نہیں لا سکتے تو مجھے سبزی کا سینڈوچ لا دو۔ اس نے بھی جاپانیوں کا مخصوص جواب دیا کہ میں پتہ کر کے بتایا ہوں اور مسکرا کر دونیں بار کورٹش بجا لانے کے بعد چلا گیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود مختصرہ بتارہاتھا کہ اسے میری بات سمجھنے نہیں آئی۔

دو منٹ بعد پھر دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو سامنے ایک چھ فٹ، قوی یہیکل، خوش شکل اور خوش لباس در میانی عمر کے شخص کو موجود پایا جس کی مسکراہٹ اس کے پورے وجود سے امذی پڑ رہی تھی اچانک اس کی آڑ سے ملک جبیب الرحمن ظاہر ہوئے اور بتایا کہ موصوف پاکستان جاپان ایسوی ایشن کے صدر امیاز احمد گوندی ہیں۔ مصالحتی اور معافیت کے مرحلے سے گزرنے کے دوران ہی پتہ چل گیا کہ امیاز گوندی ایک بہت محبت کرنے والا اور گرم جوش انسان ہے جب اسے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں نے ابھی تک ناشتے نہیں کیا تو اس کی پریشانی دیدی تھی۔ ایک اچھے ایڈ مفسٹر یہ رہمہن نواز انسان کی طرح اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ ہمیں ہوٹل والوں سے مذاکرات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور کسی قریبی ریسٹوران میں چل کر پیٹ پوچا کرنی چاہیے۔ عطا اور محمود شام کو فون پر اطلاع دی گئی کہ وہ جلدی سے ہوٹل کی لابی میں آ جائیں

کیونکہ تقریب کے آغاز میں وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔

کمرے سے نکلنے اور تالہ لگانے کے دوران ابھی امتیاز گوندل صرف یہی بتا پایا تھا کہ اس کا تعلق منڈی بہاؤ الدین سے ہے کہ وہی افسر نما دیش ہاتھ میں ایک لفاف سالیے پھر آپنچا۔ اب چونکہ میرے ساتھ جاپانی بولنے والے دوستی تھے اس لیے گفتگو آسان ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ موصوف ٹوٹا فش کے بجائے کسی اور مچھلی کا سینڈوچ لے آئے ہیں جس کے ساتھ تازہ بزی کا سلااد بھی ہے۔ میں نے اپنے سمجھانے اور اس کے سمجھنے پر آفرین کی تو اس کی مکراہٹ اور زیادہ پچھلی گئی۔

Johnnathans نامی ریستوران کا سلسلہ وہاں میکڈ و نلڈ کے ایف سی اور پیز اہٹ سے زیادہ مقبول نظر آیا۔ ٹوکیو میں ایک دوسرا چین Full Joy کے ریستوران بھی جگہ جگہ نظر آئے۔ امتیاز گوندل کے ساتھ ٹویاما شہر سے ملک متاز زیر اور مالک بھی آئے تھے کہ آج کی رات اور کل کا دن ہمیں ان کا مهمان ہونا تھا۔ یہ سب لوگ ہی بہت محبت کرنے والے تھے۔ متاز سر گودھا اور زیر فیصل آباد کار ہنے والا ہے اور دونوں کی حس مزاح بہت تیز ہے۔ چنانچہ انہوں نے دو چار ملاقاتوں کا تکلف بھی نہیں کیا اور ہمیں ملاقات میں ہی اس قدر کھل گئے کہ دس پندرہ منٹ بعد ہی مہمان اور میزبان میں تفریق کرنا مشکل ہو گیا۔

زیادہ تر یہی موضوع زیر بحث رہا کہ پرنس میں غیر مانوس خوراک، ذائقے اور حلال حرام اور ذبیحے کے مسائل کا کیا حل نکالا جائے۔ آخری نتیجہ یہی تھا کہ آدمی غیر مانوس خوراک اور ذائقے کا تو عادی ہو جاتا ہے، حرام سے پچتا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں لیکن ذبیحہ کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ حاضرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ مجبوری کی حالت میں 'سم اللہ پڑھ کر کسی بھی حلال جانور کا گوشت کھایا جاسکتا ہے جبکہ کچھ لوگ اسے حرام قرار دے رہے تھے۔ خدا بھلا کرے عالم آن لائن، کیوں وی اور کچھ دوسرے مذہبی پروگرام کا جنہوں نے نان ایشور پر بے مقصد بخشیں کر کر کے لوگوں کو اس قدر کنیوڑ کر دیا ہے کہ اس نوع کے عملی طور پر جگہ جگہ پیش آنے والے معاملات اور سوالات کا بھی کوئی تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ لے دے کے ایک جاوید غاذی صاحب ہیں جو دو ٹوک بات کرنے کا توصلہ رکھتے ہیں، اللہ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، انشاء اللہ ان سے اس مسئلے پر رائے لوں گا۔ کاش ہم نے وقت پر اجتہاد کیا ہوتا تو آج ہر آدمی اپنا اپنا اسلام ڈنڈے کی طرح دوسروں پر نہ آزماتا۔

جاپان میں پاکستانیوں کی آمدورفت اور سیاسی روایط کی تاریخ تو پرانی ہے لیکن وہاں مستقل طور پر قیام پذیر اور کاروبار کرنے والوں کی تعداد سفارت خانے کے اعداد و شمار کے مطابق ۸۶۱۰ ہے اور ان میں سے بھی ۸۰ فیصد لوگ گزشتہ میں برس میں یہاں آئے ہیں اور کم و بیش سب کے سب سینڈ ہینڈ گاؤں کے کاروبار سے متعلق ہیں جنہیں پتے نہیں کیوں رہی کنڈ بیشنڈ کہا جاتا ہے۔

جاپان کے قوانین کے مطابق یہاں رہائش رکھنے اور کاروبار کرنے کے لیے جاپانی یہوی کا ہونا ضروری ہے، سو مدد و دعے چند لوگوں کو

چھوڑ کر سب نے ہی مقامی عورتوں سے شادیاں کر رکھی ہیں اور بیشتر ایک نکٹ دو مزے لے رہے ہیں۔ مالی آسودگی کی وجہ سے کیونکہ دودو گھر چلانا کوئی مشکل نہیں اس لیے وہ اس قانون بخشن کو مصلحت اندریشی اور ضرورت کا نام دے کر مطلبیں ہیں۔

البتہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اپنا قیام قانونی ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی "ضرورت" والی بیویوں سے بناہ کرتے ہیں اور مطلب نکل جانے کے بعد ان سے پچھا نہیں چھڑاتے۔ سواں مشاعرے میں بھی خواتین کی اکثریت جاپانی عورتوں کی تھی جو اپنے شوہروں کے ساتھ ان کی تہذیب کا ایک مظہر ہدیت کے لیے آئی تھیں۔

اشتہارات اور بیزرس میں مشاعرے کے ساتھ ساتھ ایک کھلے مذاکرے کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔ غالباً اس سے منتظرین کی مراد Open House Debate نماکسی چیز سے تھی لیکن ہوا یہ کہ ہم تینوں نے جاپان، اردو اور دونوں ملکوں کے تاریخی روابط کے بارے میں کچھ غیر سکالی کی باتیں کی اور سوال جواب کے سیشن میں حاضرین نے کیونٹی کو درپیش مسائل کا ذکر کیا۔ پاکستانی سفارت خانے کی نمائندگی فرست سیکرٹری عبدالواحد خان نے کی۔ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی کیونٹی اور ایمپیسی کے درمیان تعلقات کوئی زیادہ خوشنگوار نظر نہیں آئے جس کی تفصیل سے ہمیں بعد میں آگاہی ہوئی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اصل مسئلہ اختلافات اور شکایات کا نہیں ابلاغ اور اعتماد کا ہے جو ذرا سی سنجیدہ کوشش سے حل ہو سکتا ہے۔ ہم نے دونوں پارٹیوں کو حفظیہ ہوشیار پوری کے اس شعر پر غور اور عمل کرنے کی دعوت دی کہ

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

مشاعرہ در مشاعرہ

کرکٹ کے نیست مجھ اگر بغیر کسی اور مقیم کے اوپر تلتے ہوں تو انہیں Back to Back کہا جاتا ہے لیکن اگر دو مشاعرے یکے بعد دیگرے منعقد ہوں تو انہیں کیا کہا جائے گا، یہ سوال ہمیں جاپان میں درپیش آیا جب نوکیو کے مشاعرے سے اگلے دن نویاما میں مشاعرے کی خبر سنائی گئی۔ اس مسئلے کا حل سودا کے ایک شعر میں ملا جو کچھ یوں ہے کہ

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہوتا ہے تجھ کو میر سے اتنا د کی طرف

لیکن اس "مشاعرہ در مشاعرہ" کے احوال سے پہلے کچھ اور باتوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پاکستان جاپان ایسوی ایشن کے جزو سیکرٹری ملک حبیب الرحمن نے بتایا کہ جاپان کی وزارت خارجہ اور کلپرڈ پارٹمنٹ کی طرف سے انہیں مسلسل فون، فیکس اور ای میل پر پیغامات ملے ہیں کہ ان کے مہمانوں کی وہ لوگ بھی میزبانی کرنا چاہتے ہیں اب میرا اور عطااء کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کو اپنی اپنی مصروفیات

کے باعث جلد واپس آتا تھا۔ اس نوع کی دعوت محمود شام کو جاپان کے کراچی قونصلیٹ کے حوالے سے بھی مل چکی تھی۔ سودہ رک گئے اور تادم تحریر جاپانی تہذیب و تاریخ سے متعلق ایک مطالعاتی دورے میں معروف ہیں لیکن جس بات سے ہمارے میزبان بجا طور پر متاثر تھے وہ یہ تھی کہ دو ماہ پہلے ہمارے دو تین مرکزی وزیر جاپان سے ہو کر گئے تھے لیکن مذکورہ مکملوں نے ان کے آنے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یہ بات اس امر پر شاہد ہے کہ جاپانی لوگ اہل سیاست سے زیادہ اہل ادب و فن کی عزت کرتے ہیں۔

ٹوکیو کے مشاعرے کی سب سے اہم بات پروفیسر ہیرو جی کتاڈ کا اور جاپانی طالب علم نشی موراشوبے کی گفتگو تھی۔ پروفیسر کتاڈ کا دا ستوپنکا یونیورسٹی کے استاد ہیں (جن کے کریڈٹ پر غالب اور فیض کی شاعری کے جاپانی مترجم ہیں) اور نشی موراشوبے ان کا ہوتا ہر طالب ہے جو اپنے استاد سے بھی زیادہ صاف اور فرمادو بولتا ہے۔ پروفیسر کتاڈ کا نے بتایا کہ وہ ہر سال اپنے طلبہ کو باری پاکستان اور ہندوستان کا مطالعاتی دورہ کرواتے ہیں تاکہ وہ اس تہذیب اور ماحول کو بھی سمجھ سکیں جس کی زبان وہ سیکھ رہے ہیں نوجوان شاعر عامر بن چلی کے اس شعر کو بہت پسند کیا گیا۔

حسن اور حکومت پر زور کس کا چلتا ہے
یہ بتاؤ ان کی عمر کتنی ہوتی ہے؟

اگرچہ مشاعرہ گاہ میں تقریباً ہر خاتون کے ساتھ ایک دوپھے تھے جو حسب توفیق رونے چلانے اور دوڑنے بھانگنے میں معروف تھے لیکن ایک بچہ کچھ زیادہ ہی ناراض تھا۔ اس کی جاپانی ماں اور پاکستانی والد اگرچہ گاہے بگاہے اسے خاموش کرنے کے لیے ہال سے باہر لے جاتے تھے۔ لیکن واپس آتے ہی وہ اپنا کام دوبارہ شروع کر دیتا۔ بعد میں اس کے والد نے بڑی مخصوصیت سے وضاحت کی کہ دراصل یہ اس کا پہلا مشاعرہ تھا۔

اس پر مجھے ہیرس کا ایک مشاعرہ یاد آیا جس میں ایک بزرگ اپنے بچوں کے اصرار پر چکلی بارکسی شعری محفل میں شریک ہوئے پانچ چھٹے شاعر گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی بہو کا کندھا ہالا یا اور بڑے تشویش آمیز لمحے میں بولے۔

”شاعر ہی آتے جا رہے ہیں۔“

ٹوکیو سے ٹویاما کار سے کوئی چھسات گھنٹے کا سفر تھا میزبانوں کی کوشش تھی کہ یہ سفر بذریعہ ہوائی جہاز کیا جائے تاکہ مہماںوں کو زحمت نہ ہو اور انہیں آرام کا موقع مل سکے لیکن خلاف معمول اس دن رش کچھ زیادہ تھا اس لیے مکان فلامیٹ پر سینیں نہل سکیں ٹویاما میں ہمارے پاس صرف ایک ہی دن تھا چنانچہ اگلے دن دو پہر کی فلامیٹ پر جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہم جاپان کے اس شہر کی سیر سے محروم رہ جاتے جہاں پاکستانی سب سے زیادہ تعداد میں تھے۔ سو ہمارے اصرار پر یہی طے پایا کہ بذریعہ کا ررات کا سفر نہیں بہتر ہے کہ گپ شپ میں وقت

آسانی سے کٹ جائے گا اور ہم دو بیجے تک منزل پر پہنچ کر سونے کے قابل بھی ہو سکیں گے صرف اگلی صبح کاناٹشہ ذرا لایٹ ہو جائے گا۔ کاروں کے تاجر ان کی مہماں کی ایک فاکدہ یہ ہوا کہ سفر کے لیے جو کار منصب کی گئی اس میں نہ صرف ہم آٹھ آدمی بعد سامان ہماگے بلکہ اس کی وسعت داماں اسکی تھی کہ غالب کی طرح ”بقدر شوق نہیں ظرف تنگاے غزل“، کا احساس بھی نہیں ہوا البتہ عطاً امتیاز گوندل اور زیر کی سگریٹ نوشی سے فضابار بار میر صاحب کی یادِ دلاتی تھی جنہوں نے کہا تھا۔

دیکھ تو دل کے جاں سے انتہا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے انتہا ہے

امتیاز گوندل نے ٹویاما شہر میں پاکستانیوں کی آمد اور وہاں استعمال شدہ گاڑیوں کے کاروبار کے فروع پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ شہروںی سرحد سے قریب ہے اس کاروبار سے متعلق روپیوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے جو عام طور پر ما فیا کی شکل میں کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جاپانی ما فیا کے لوگ بھی اس کاروبار میں موجود غیر معمولی منافع کے باعث کبھی کبھی پچھلے گزبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جاپان کا قانون اور وہاں کی پولیس ایسے سخت انصاف پسند اور غیر جانبدار ہیں کہ پاکستانی تاجر پوری آزادی اور احساس تحفظ کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور قانون ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دیتا۔ با توں با توں میں پاکستان کی ایک خاتون صحافی کا ذکر بھی آیا جس نے اپنے انگریزی اخبار میں ٹویاما کی پاکستانی کیونٹی کے خلاف سنتی سنائی، بلا تحقیق اور ما فیا کی پھیلائی ہوئی خبروں پر منی ایک روپرٹ شائع کی جس کی وجہ سے جاپانی میڈیا میں قرآن پاک کی شہادت کے ایک واقعہ کو بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا بعد کی تحقیقات ثابت ہو گیا کہ یہ ایک سوچی کبھی سازش تھی جس کا مقصد پاکستانیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا، انہیں حکومت کی نظروں میں مشکوک بنانا اور کاروں کے کاروبار کے میدان سے بچانا تھا۔ امتیاز گوندل نے بڑے فخر سے بتایا کہ کیونٹی کی اجتماعی کوششوں کے باعث نہ صرف مقامی پولیس اور حکومت کے شہہات دور ہوئے بلکہ میڈیا نے بھی اپناروپی تہذیل کیا اور اب ٹویاما کی پاکستانی کیونٹی کو ہر جگہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محمود شام نے بتایا کہ متعلقہ صحافی خاتون کسی جریل کی عزیزی ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی غلط اور تنازع در پوری میں پیش کر چکی ہے جن کا ادارے نے نوٹس تو لیا ہے مگر صورت حال کے بارے میں صحیح اور مفصل معلومات نہ ہونے کے باعث معقول محاسبہ نہیں ہو پاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ لوگ سفارت خانے کے توسط سے اس نوع کے معاملات کو متعلقہ اداروں کے علم میں باضابطہ طور پر لا سکیں تاکہ اس طرح کے واقعات کی روک تھام ہو سکے۔ اس پر بات پھر سفارت خانے کے غیر ہمدردانہ اور منفی طرز عمل کی طرف مزگنی اور ملک جیب ارجمن نے شکایات کا ایک ایسا دفتر کھول دیا جسے بند کرنے کے لیے زیر نے گاڑی ایک پارکنگ میں روک دی۔ جاپان میں موڑوے پر واقع سرو مزار یا کو پارکنگ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہمارے میز بانوں کو بھی نہیں آتا چنانچہ انہوں نے مہماںوں سے فرد افراد اپوچھنا

شروع کر دیا کہ وہ کیا کھانا پسند کریں گے؟

تیار خوراک کے ایک بہت بڑے کاؤنٹر کے سامنے ایک بار پھر حلال حرام اور ذبیحہ کی بحث شروع ہو گئی۔ عامر بن علی میرے لیے مشین سے گرم کافی کا ایک ٹن نکال لایا جو میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ آج تک میں نے دنیا بھر میں اس طرح کی مشینوں سے نہ بتہ مشروبات ہی نکلتے دیکھے تھے۔ میں نے یہ سمجھ کر چیپس اور کافی پر اکٹھا کرنا چاہا کہ یہ بالکل محفوظ خوراک ہے لیکن زیر نے مجھے چیپس کا الفاظ کھولنے سے روک کر اس میں شامل اجزاء اور استعمال ہونے والے خوردنی تیل کا جائزہ لیا اور بتایا کہ یہ معاملہ کچھ مخلوق ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی جگہ ایک اور کمپنی کے ساختہ چیپس لے آیا مگر دل میں جو گردہ پڑنی تھی وہ پڑھ کی تھی سو وہ پیکٹ آخوندک ان کھلا ہی رہا۔

ٹویاما کا قصبہ نما شہر ایک پہاڑی علاقے میں واقع ہے لیکن ہم ان پہاڑوں پر سے اس طرح گزرے کہ نہ پہاڑیوں کو خبر ہوئی اور نہ ہمیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ٹوکو سے ٹویاما تک تقریباً چالیس ایسی مرگمیں راستے میں پڑتی ہیں جن میں سے بعض کی لمبائی میلوں پر محیط ہے یہ مرگمیں تقریباً تھیسٹر نگ کا شاہ کار کی جاسکتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی اور صنائی کے بیان کے لیے کوئی مناسب تشبیہ اور مثال کم از کم میری دیکھی ہوئی دنیا میں تو نہیں ہے اور واضح ہو کہ میں نے خاصی دنیادیکھ رکھی ہے۔

ٹویاما.....جاپانی پاکستان

ٹویاما میں ہمارا قیام عامر بن علی کے اپارٹمنٹ میں تھا جس میں ہماری آمد عرب کے روایتی اونٹ جیسی تھی کہ ایک ایک بیڈروم میرے اور محمود شام کے حصے میں آیا اور عطا نے اپنا بستر لیونگ روم کے فرش پر جماليا کہ یو جوہ اسے فرشی بستر سوت کرتا تھا۔ مالک مکان کو داخلی دروازے کے بالکل ساتھ وہ اسیں ہاتھ پر واقع اس ڈرے نمادفتر میں جگہ ملی جہاں سونے کے لیے جگہ صرف جاپان ہی میں نکالی جاسکتی ہے۔ عامر نے ہمارے لیے جاپان کے مخصوص شب خوابی کے لبادوں کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن ہم تینوں نے ان پر شلووار قمیض کو ترینج دی کیونکہ بصورت دیگر غالب امکان یہی تھا کہ انہیں پہن کر سونے کا نتیجہ ہمارے گاؤں میں استعمال ہونے والی دھوتی سے مختلف نہ ہو گا جسے دیہاتی بھائی کمر پر باندھ کر سوتے ہیں اور صبح وہ ان کے اوپر چادر کی طرح پڑی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات انہیں بھی پڑی ہوتی۔

صح قریباً آٹھ بجے عطا نے میرا کندھا بلا یا اور کہا تم بہت سوچ کے ہو اٹھ جاؤ اب میری باری کیونکہ میں اب تک ایک پل بھی نہیں سوسکا۔ میں نے کہا میں نے خود تمہارے غیر انسانی قسم کے خرائے سنے ہیں۔ بولا وہ میں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے لے رہا تھا کہ آخر رات تو کسی طور کا ٹھنٹھی تھی۔ سو میں اٹھ کر لیونگ روم میں آگیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو خوب دن چڑھا ہوا تھا۔ اب پتہ چلا کہ جاپان کو چڑھتے سورج کی سر زمین کیوں کہا جاتا ہے۔

ناشیت کا انتظام امتیاز گوند کے دفتر میں تھا جہاں دسکی پر اٹھے ہمارے منتظر تھے لیکن تیار ہوتے اور نکلتے ہوئے دو پھر کے گیارہ نج

گئے۔ سو طے ہوا کہ ناشتے سے برخچ کا کام لیا جائے لیکن بات اس سے بھی آگے نکل گئی کیونکہ ناشتے کے ہر آنٹم کا "بادرچی" جدا گانہ تھا اور ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس کی پیشکش پر زیادہ توجہ دی جائے۔ سواں موقعے پر قتیل شفائی مر جوم بہت یاد آئے جن کا ایک مصروف ہے۔

بٹ نہ جائے ترا بیمار سیحاوں میں

اور پھر اسی رعایت سے مر جوم حسن رضوی بھی یاد آیا کہ وہ ہر مشاعرے میں قتیل سے شرارت اس غزل کی فرمائش کرتا تھا اور پھر اس کے مطلع پر زیر لب ایسے ایسے دلچسپ تبصرے کرتا تھا کہ پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی تھی۔ چلنے لگے ہاتھوں وہ مطلع بھی پڑھ بیٹھے۔

قص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنوں باندھ لیے پاؤں میں

امتیاز گوند کے شوروم (جسے وہاں پارکنگ کہا جاتا ہے) کے ارد گرد کئی میل تک وقفہ و قفے سے طرح طرح کی کاریں ہزاروں کی تعداد میں کھڑی تھیں جہاں سے انہیں دنیا کے مختلف ملکوں میں بھجوایا جاتا ہے جن میں سرفہرست لاطینی امریکہ کے ممالک تھے۔ ان کے علاوہ بڑی مارکیٹوں میں روس، دومنی، پاکستان اور افریقہ کے کچھ ملک شامل تھے۔ طریقہ کاریہ تھا کہ پورے جاپان سے جمع کردہ استعمال شدہ کاریں مقررہ دنوں پر نیلام کے پیش ہوتی تھیں اور خریدنے والے کمپیوٹر کے ذریعے بولی لگاتے اور بڑھاتے تھے اور عام طور پر ایک کاررومنٹ سے کم عرصے میں فروخت ہو جاتی تھی یعنی کمپیوٹر سکرین پر صرف کار کی تصویر اور چند بیانی معلومات نمودار ہوتی تھیں اور خریدار اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھنے "لکھ" کے ذریعے اپنی مطلوبہ یا پسندیدہ کار کی بولی میں حصہ لے کر اسے خرید لیتے تھے اور یہی وہ کار و بار تھا جس میں پاکستانی گزشتہ پندرہ بیس برس سے چھائے ہوئے تھے۔ امتیاز گوند اور وہاں پر موجود دیگر پاکستانی کارڈیلر دوستوں کا خیال تھا کہ اگر حکومت پاکستان انہیں موقع دے تو وہ پاکستان میں بہترین کاریں انتہائی کم قیمت پر فراہم کر سکتے ہیں۔ جاپانی لوگ عام طور پر تمیں سال کے بعد کار بدلتے ہیں سو بیشتر کاریں ایسی عمدہ حالت میں ہوتی ہیں کہ ان میں اور نئی کار میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور قیمتوں کا عالم یہ ہے کہ ۱۳۰۰ سی کی کار اس نیلامی میں پاکستانی کرنی کے مطابق ڈیڑھ لاکھ میں مل جاتی ہے۔ کرایہ کاغذات کی تیاری اور تمام نیکس شامل کر کے یہ کراچی میں پانچ سوا پانچ لاکھ میں بیٹھنے جاتی ہے جبکہ یہاں مقامی طور پر تیار کی ہوئی نسبتاً بہت ناقص کاروں سے بارہ لاکھ کے درمیان پڑتی ہے۔ موجودہ بجٹ میں پانچ سال سے زیادہ پرانے ماڈل کی کاروں کی امپورٹ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ تو یاماکے پاکستانی کارڈیلرز کا خیال تھا کہ یہ قدم پاکستان میں تیار ہونے والے کاروں کی طلب بڑھانے اور ان کے بزنس میں ملوث صاحبان اقتدار کو تحفظ دینے کے لیے اٹھایا گیا ہے وہ نہاب بھی عام آدمی کو چھوٹی کار بہت اچھی حالت میں انتہائی سستی قیمت پر مل سکتی ہے۔

میں چونکہ اس معاملے کی تفصیلات نہیں جانتا ہنداممکن ہے کہ حکومت پاکستان کے پاس اپنی اس پالیسی کا کوئی معقول جواز ہو لیکن ایک عمومی تاثر بھی ہے کہ اگر ان استعمال شدہ گاڑیوں کی امپورٹ میں آسانیاں پیدا کی جائیں تو پاکستانی عوام کو دوڑھائی لاکھ میں بہت اچھی اور پانیدار گاڑیاں مل سکتی ہیں۔

امتیاز گوندل کے دفتر سے ہم لوگ تین چار گاڑیوں کے ایک قاتلے کی صورت میں چلے اور چندایے دفتروں میں رکے جن کے مالکان کا تعلق مشاعرہ کمیٹی سے تھا یہ گویا ایک خیر سگالی کا دورہ تھا جس کا مقصد پاکستانی کیونٹی میں اتفاق اور بھائی چارے کے جذبات کو ابھارنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا کہ یہ مشاعرہ اس شہر میں ہونے والی پہلی باقاعدہ ادبی تقریب تھی۔ امتیاز گوندل نے بتایا کہ ہماری یہ چند منٹ کی وزٹ ان احباب کو مدتوں یاد رہے گی اور وہ آئندہ کیونٹی کے کاموں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ میں نے امتیاز گوندل کو مشورہ دیا کہ اسے آئندہ انتخابات میں اپنے علاقے منڈی بہاؤ الدین کی کسی سیٹ سے ایکشن لڑانا چاہیے کیونکہ ایسی سیاسی سوجھ بوجھ والے لوگ ہماری اسمبلیوں میں کم کم ہیں اس پر ملک متاز نے لقمہ دیا کہ پاکستان میں سیاست' یا لفاظ سے نہیں دولت سے کی جاتی ہے اور اگر وہاں ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم یہاں آتے ہی کیوں!

مشاعرے سے پہلے ہماری یقین و ہاتھیوں کے باوجود کہ ہم عامر کے اپارٹمنٹ میں بہت آرام سے ہیں، ہمیں کیناں پارک ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ چونکہ مشاعرہ بھی وہیں ہے اس لیے ہمیں آرام کرنے اور تیار ہونے میں آسانی ہو گی چنانچہ ایک بار پھر سامان سمیٹا اور پھیلا یا گیا۔ اس مشاعرے کا ہال بھی نسبتاً بڑا تھا اور سامعین بھی تعداد میں تو کوئے زیادہ تھے البتہ ایک بات مشترک تھی کہ دونوں جگہ کسی مقامی شاعر نے اپنا کلام بلا غلط نظام پیش نہیں کیا ملک متاز نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں لوگ ہندسوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ ان کے پاس لفظوں کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عامر بن علی کوئی نئی غزل کہہ لے تو اسے سامعین کی تلاش میں پاکستان جانا پڑتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اسے ایک شعر میں ہزار جاپانی ہیں (وہ ہزار پاکستانی روپے) اور ایک غزل وس مان (ایک مان = سو امریکی ڈالر) میں پڑتی ہے۔ اس بات کا سب سے زیادہ لطف عامر بن علی نے لیا کہ وہ فطرتاً ایک خوش طبع توجوان ہے اور اچھا جملہ کہنے اور سہنے کی تاب رکھتا ہے۔

مشاعرے کے بعد کھانا ایک کورین ریستوران میں تھا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ ہر میز کے درمیان ایک برتنی انگلیٹھی نصب تھی۔ بیرے آرڈر کے مطابق کچا لیکن سیلیت سے کٹا ہوا مرغی، مچھلی اور گائے گا گوشت پلیٹوں میں لا کر رکھ دیتے تھے جسے گا کہ خود آگ کے اوپر رکھی ہوئی ایک جالی پر سینکتا پکاتا اور کھاتا تھا۔ میری جھجک دیکھ کر میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مقامی میزبان نے بزریوں کے نام پر پتہ نہیں کیا الابلاک میرے سامنے رکھ دیا اور ریستوران والوں کو تحریکی ڈال دی کہ وہ کوئی ایسی چیز تیار کر کے دیں جو میں کھا سکوں لیکن

سوائے سفید چاول کے چند قبوں کے دل کی چیز کو بقول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سو میں نے اللہ کا نام لے کر اور بسم اللہ پڑھ کر چکن کے چند تقلیل نوش جان کئے کہ مجبوری میں تو بہت سہ لوگوں دی گئی ہیں یہاں تو صرف ذیبح کا مسئلہ تھا اور بقول ہمارے ایک دوست کے اگر آپ کبھی پاکستان میں مرغیاں ذبح ہوتے دیکھ لیں تو یہ مسئلہ خود بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

اوسا کا اور سویمانے

عامر بن علی کے دوست اعجاز سے دن میں اس کے دفتر میں سرسری ملاقات ہوئی تھی جس میں صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اتنی کم عمری کے باوجود ایک بہت اچھا اور کامیاب بنس میں ہے۔ کھانے کے دوران اس سے بات چیت ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ خاصا زندہ دل اور جملے باز بھی ہے لیکن اس کے اصل جو ہر اس وقت کھلے جب وہ ہم تینوں مہمانوں کو رات کے کھانے کے بعد ٹویاما اور اس سے ملختہ ایک دو چھوٹے چھوٹے شہروں کی سیر کرا رہا تھا راستے میں اس نے کھانے میں شریک مقامی کمیونٹی کے کچھ احباب کے بارے میں ایسے دلچسپ مختصر مگر کثیلے تبرے کئے کہ ہمارا ہستے ہستے براحال ہو گیا وہ بھی غالباً اسی اصول پر عمل پیرا تھا کہ بندہ بے شک ضائع ہو جائے جملہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

شب گردی کے دوران اچانک ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں بہت سی لڑکیاں اور لڑکے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ یہ سمجھے کہ یہ جووم کسی سینما گھر یا ناٹ کلب سے نکلا ہے مگر پھر ان کا رنگ ڈھنگ، بے تکلفی اور ہمیں مخاطب کرتی ہوئی آوازیں سنیں تو شپر ہوا کہ معاملہ کچھ گزبر ہے۔ ہم نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں؟“ اجڑا نے براپا سامنہ بننا کر جواب دیا۔ ”یہ پوچھ رہی ہیں کیا آپ مساج کرنا پسند کریں گے؟“ لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت کچھ اور کہہ رہی تھی۔

جاپان اگرچہ امریکہ کی نسبت ایک قدامت پسند ملک ہے لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر وہاں بھی ”ناٹ لائف“، ایک ایسی اصطلاح بنتی جا رہی ہے جس کی آڑ میں جس فروشی سمیت بہت سے ایسے کار و بار چال رہے ہیں جن میں عورت کو تفریق اور تلنڈ کے سامان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کے اتنے شور شرابے کے باوجود وہاں ان سب خرافات کی گنجائش کیسے نکل آتی ہے اور وہ معاشرے جو ایک چڑیا کا پرلوٹنے پر بے چین ہو جاتے ہیں وہ عورت کی اس تزلیل پر کیونکر خاموش رہتے ہیں۔ ہم نے

اس نے ترت جواب دیا۔ ”گانا تو مجھے یاد نہیں لیکن آپ کی بات میں سمجھ گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی ایک بغلی سڑک کی طرف موڑ دی جہاں دور دور تک ن آدم تھانہ آدم زاد۔

۱۳ جون کو دو پہر دو بجے اوسا کا یو نیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہمیں وہاں کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے ملتا تھا۔ ٹو یاما سے اوسا کا تک

تقریباً چار گھنٹے کا سفر تھا۔ ناشتا کرتے کرتے دس نئے گئے۔ جاپانیوں کی وقت کی پابندی چونکہ ہم سن ہی نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے جب ڈاکٹر فخر الحق نوری نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اب معاملات خطرے کی حد کو عبور کرنے ہی والے ہیں تو ہم نے بمشکل میزبانوں سے اجازت لی جنہوں نے ہوٹل کی انتظامیہ کو کہہ کر خاص طور سے مغربی ناشتے کا انتظام کروایا تھا اور اب مصر تھے کہ ہم ان کے حسن انتظام کی داد عملی طور پر دیں یعنی ایک اندھے کا ہمیں دینا پڑا حساب۔

کار چلانے کی ذمہ داری اس بار بھی زیرِ فصل آبادی پر تھی جو بل کھاتی ہوئی سرگن کی دیواروں سے ایک ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رکھ کر ایک سوتیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہوئے دوستوں سے اس طرح مزکرات کرتا تھا کہ اس کی آنکھیں پیچھے آتی ہوئی کاروں کو براہ راست دیکھ سکتی تھیں۔ اس اندھے اعتماد کی وجہ وہ اپنے بائیس سالہ تجربے کو قرار دیتا تھا جو بقول اس کے ایکیڈنٹ فری تھا۔ اس کا دوسرا شوق موبائل یا ساتھی کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے مسلسل باتیں کرنا تھا۔ ملک جبیب الرحمن اس کی ان دونوں عادتوں سے بہت چڑتے تھے مگر ہر بار آخری فتح زیر ہی کی ہوئی جس کی حس مزاج واقعی بہت عمده تھی۔ وہ انتہائی سپاٹ چہرے کے ساتھ بڑے انداز میں ایسا جملہ کہتا تھا جس کی کاٹ تہہ در تہہ اور بہت تیز ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا مزاج نگار دوست ملتان کا شاعر خالد مسعود بہت یاد آیا کہ وہ بھی اس ہنر کا بادشاہ تھا۔

راتے میں ہمیں عامر بن علی اور مظہر دانش کو بھی لینا تھا جس میں مزید پندرہ ہیں منٹ لگ گئے۔ اب ایک طرف ملک جبیب الرحمن کی ظاہری اور ڈاکٹر فخر الحق نوری کی پوشیدہ تشویش تھی اور دوسری طرف زیر کی خود اعتمادی کہ میں نہ صرف آپ کو دو بیج سے پہلے اوسا کا یونیورسٹی پہنچاؤں گا بلکہ راتے میں چائے کا وقفہ بھی ہو گا اور لطف کی بات ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

بعد میں زیر نے بتایا کہ اس نے چائے کے وقفے کے دوران اس علاقے کا ایک ایسا روڈ میپ حاصل کر لیا تھا جس کے مطابق ایک شارٹ کٹ کے ذریعے تقریباً ۳۰ میل کا فاصلہ کم ہو گیا۔ چنانچہ جب دو بیجے میں دس منٹ پر ہماری گاڑی یونیورسٹی کے مرکزی دروازے میں داخل ہوئی تو زیر نے جن نظروں سے ملک جبیب الرحمن کو دیکھا ان پر کوئی قتل مشتعل بھی ہو سکتا تھا۔

سو یہاں نے کوئی اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ اور پنٹل کالج میں نیا نیا آیا تھا اور ایسی کتابی (Bookish) اردو بولتا تھا جسے سننے کو ہمارے کان ترس چکے تھے۔ اس کے ملک مل کر بولنے اور ہر وقت بہت سرپنے کا اندازہ ہن پر ایک خوشنگوار تاثر چھوڑتا تھا۔ اس کے بعد گاہے بگاہے اس سے سنگ میل پہلی کیشنز کے دفتر میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کا غلام عباس کے فن و شخصیت پر کیا ہوا کام اردو کے غیر ملکی طلبہ میں اسے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ چند ماہ قبل لاہور میں ملاقاتات کے دوران میں نے اس سے اپنے بارے میں زیر اشاعت کتاب ”تارے مرے ہم سفر“ بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ پچھلے دنوں عزیزی عامر بن علی مجھ سے ملنے آیا تو میں نے وہ کتاب اس کے ہاتھ بھجوادی اور سنگ میل

کے افضل احمد سے سویمانے کا فون نمبر لے دیا کہ اس سے ایڈریس لے کر کتاب بھجوادیتا۔ چند دن بعد عامر بن علی کا فون آیا اس نے کہتا کتاب تو میں نے بھجوادی ہے مگر آپ تو کہتے تھے کہ سویمانے فر فرا در بہت اچھی اردو بولتا ہے۔ یہ آدمی تو انگریزی بھی واجبی سی بول رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سویمانے نام کا کوئی اور آدمی تھا جو انحضر و پالوجی کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اور اس سلسلے میں پاکستان بھی آچکا تھا اور یہ کہ سویمانے جاپان میں ویسا ہی عام اور مستعمل نام ہے جیسے ہمارے یہاں جاوید پرویز قشم کے نام ہوتے ہیں۔ میں دیکھ کر سویمانے کی مسکراہٹ سمجھنے نہیں سخت رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان چند نہیں میں اس کا وزن خاصاً کم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر فوری نے بتایا کہ جاپان میں شوگر کا مرض بہت عام ہے اور سویمانے نے صرف اس کا مریض ہے بلکہ بہت لاپروا اور غیر محتاط بھی ہے۔ میں نے سوچا کہ وقت ملا تو ہم دونوں ہم مرض اور شوگر شریک بھائی اس موضوع پر تبادلہ خیال کریں گے لیکن تقریب کی دوڑ بھاگ میں آپس کی کسی بات کی فرصت نہ مل سکی۔ سو میں نے دم رخصت اسے انور مسعود کا یہ شعر سنایا اور کہا کہ اس کی تشریع اور تفصیل آئندہ ملاقات پر کی جائے گی۔

مجھ کو شوگر بھی ہے اور پاس شریعت بھی ہے
میری قسم میں نہ میٹھا ہے نہ کڑوا پانی

ترقی کرنے والی قوموں کے طور طریقے

اوسا کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استقلالیہ پروگرام کا احوال لکھنے سے پہلے ان چند باتوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس دوران میں مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں اور جگہوں کی معرفت معلوم ہو سکیں اور جن سے ایک بار پھر اس بات کی حقانیت ثابت ہوئی کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اس کے لیے سوچتی اور ستگ و دو نہیں کرتی۔ زمانہ حال میں شاید اس کی بہترین مثال جاپانی قوم اور جاپان کی ترقی ہی ہے۔

عام طور پر ہر ملک کے کرنی نوٹوں پر اس کے حکمرانوں یا اس کی تحریک آزادی کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں ہوتی ہیں، جاپان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس کے کرنی نوٹوں پر بادشاہ ملکہ، شاہی خاندان یا سیاستدانوں کے بجائے ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں اور سماجی رہنماؤں کی تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔ موجودہ نوٹوں پر موجود اہل تصویر کے ناموں اور کارناٹوں کی تفصیل تو مجھے نہیں مل سکی لیکن پانچ ہزارین کے نوٹ پر جس خاتون شاعرہ کی تصویر ہے اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ انیسویں صدی کی ایک بڑی شاعرہ تھی اور تقریباً ہمارے مرزا غالب کی ہم عصر تھی۔

جاپانی اپنے بچو اور قوم کی کردار سازی کس طرح کرتے ہیں اس کی تفصیلات بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ سو میں ان کے تعلیمی اور معاشرتی سسٹم پر تو شاید روشنی نہ ڈال سکوں لیکن اس کے نتائج اور ثرات پر یقیناً بات ہو سکتی ہے کہ جاپانیوں سے ملتے وقت قدم قدم آپ کو ان

خوبیوں کا احساس ہوتا رہتا ہے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں بدرین میں شکست کھانے کے باوجود اس قوم کو دنیا کی بہترین قوموں میں سے ایک بنا رکھا ہے۔ شاید اس واقعے کا ذکر میں نے پہلے بھی کہیں کیا ہے اگر ایسا ہے بھی تو یہ بات ایسی ہے جسے صحیح معنوں میں قدم کر کہا جا سکتا ہے۔

ایک دوست نے بتایا کہ جاپان میں اپنی ملازمت کا دورانی ختم کرنے کے بعد جب وہ پاکستان آرہا تھا تو اسے کچھ جاپانی دوستوں اور رویقان کارنے مختلف تجھنے پیش کئے۔ جواباً اس نے بھی ایک مہربان جاپانی بزرگ رفیق کار کے لیے ایک تجھ فریدا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ جاپان میں اشیا کی خریدار پر ایک Consumption نیکس لگتا ہے جو غیر ملکیوں سے اس لیے وصول کیا جاتا ہے کیونکہ اس نیکس کی غایت یہ ہے کہ یہ کسی چیز کے جاپان کے اندر استعمال ہونے پر لاگو ہوتا ہے۔ دوست نے بتایا کہ پہلے تو جاپانی بزرگ نے تجھنے لینے میں ہی بہت تامل کا اظہار کیا لیکن میری بات کا قائل ہونے کے بعد اس نے ایک عجیب و غریب فرمانش کی اور کہا کہ میں اس شرط پر یہ تجھنے قبول کروں گا اگر تم اس کی خریداری رسید بھی مجھے ساتھ دو گے۔

ہماری معاشرتی اقدار کے حوالے سے تجھنے کے ساتھ اس کی خریداری کی رسید مانگنا ایک انتہائی غیر معمولی اور بد ذاتی کی بات تھی سو پہلا خیال جو میرے دوست کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید وہ رسید کے ذریعے اس تجھنے کو واپس کر کے اپنی مرشی کی کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے یا پھر۔۔۔۔۔ لیکن اس کے استفسار پر اس جاپانی بزرگ نے جو جواب دیا وہ سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ اس سے پوری قوم کا کردار جھلک رہا ہے۔ اس نے کہا۔

”یہ رسید میں تم سے اس لیے مانگ رہا ہوں کہ بطور غیر ملکی تم نے اس پر ”مقامی استعمال“ کا نیکس ادا نہیں کیا تھا سو میں اسے استعمال کرنے سے پہلے جا کر یہ نیکس ادا کروں گا تا کہ قومی امانت میں خیانت نہ ہو۔“

اب اس بات کو اس خبر سے ملا کر پڑھے کہ گزشتہ چند ماہ میں چینی کی قیمتوں اور سپاٹائی کے حوالے سے جو ڈرامہ ہوا اس میں چند اہل زور وزر نے مل کر اس غریب قوم کے عوام کی کمائی میں سے اربوں روپے چھین لیے اور ڈکار نہیں لی۔

چلئے اب واپس اوسا کا یونیورسٹی چلتے ہیں ورنہ یہ تحریر بھی داغ کے اسی شعر کی تفسیر بن جائے گی۔

کچھ اور کام بھی اے داغ تم کو آتا ہے
وہی بتوں کی شکایت وہی گلہ دل کا

اوسا کا یونیورسٹی آف فارن منڈریز میں شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر تاکامتیع ماتو مورا ہیں جن کے چہرے سے ان کی عمر کا اندازہ کرنے میں دس بیس سال کی قلطی ایک معمولی اور قابل معافی بات ہے کہ بیشتر جاپانیوں کی طرح ان کا چہرہ بھی ایک طرح کی ”دھوکہ منڈی“ ہے کہ

ان کے نقوش کے بازی گر بھی کو اکب کی طرح کھلا دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ فیکٹی چار اساتذہ پر مشتمل ہیں۔ ما تو مورا سویمانے اور ڈاکٹر فخر الحنف نوری کے علاوہ پروفیسر کین سا کو مایا بھی یہاں پڑھاتے ہیں جن سے ہماری ملاقات تقریب کے اختتام پر ہوئی کہ وہ کسی اور جگہ مصروف تھے۔

تقریب کا عنوان ”محفل اردو“ رکھا گیا تھا ہال میں تقریبیا ستر کے قریب جا پانی لڑکے اور لڑکیاں موجود تھے اور پیشتر نے پاکستانی یا اس سے ملتے جلتے لباس پہن رکھے تھے البتہ سامنے کی دو صفوں میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں بڑے زرق برق اور آرائشی قسم کے کپڑے اور زیورات پہنے ہوئے تھیں اور کچھ نے پھولوں سے بھی سنگھار کر رکھا تھا۔ حیرت ہوئی کہ جاپان میں لڑکیوں کے لیے اردو پڑھنے کی خاطر ”امراؤ جان ادا“ بننے کی شرط کیوں عائد کی گئی ہے مگر جلد ہی اس راز سے پر دہ اٹھ گیا۔ سویمانے نے مہماںوں کے سامنے چھپا ہوا پروگرام بھی رکھا اور پھر زبانی تفصیل بھی بتائی کہ ان طالبات نے ابھی کچھ دیر بعد کو رس کی شکل میں ایک رقص پیش کرتا ہے اور یہ ساری تیاری اسی کی لیے ہے۔

استقبالیہ کلمات کے بعد سب سے پہلے طلبہ نے کو رس کی شکل میں ایک مشہور پاکستانی فلمی گیت ”جان بھاراں رنگ چمن“ اے جان من!“ پیش کیا جس کا ایک مقصد شاید یہ بتانا بھی تھا کہ اوسا کا یونیورسٹی والے اردو اور فارسی کے تاریخی رابطوں سے بخوبی واقف ہیں۔ چند نمبر پر درج آئٹیم کا عنوان تھا ”طلے پر تھاپ پڑنا“ اور سات نمبر کے آگے لکھا تھا ”جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ“ دونوں عنوان بہت دلچسپ اور منفرد نوعیت کے تھے لیکن طلبے پر تھاپ کچھ ایسے پڑی کہ طلبے کو بھی شاید ہی خبر ہوئی ہو جس کی وجہ شاید طبلہ نواز نوجوان کی نو مشقی تھی البتہ طاؤس ان باغ کا رقص ایک مشہور بھارتی فلمی گانے ”ڈولی سجائے رکھنا“ کی مقامی کوریو گرفتی پر مشتمل تھا جس کی داد دینا زیادتی ہو گی کہ ایک غیر زبان کے بولوں اور جنپی سازوں کی لے پر ایسا خوبصورت موثر رقص پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس کے بعد پروفیسر ما تو مورا نے اپنے شعبے کی کارگزاریوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ان تراجم کے بارے میں بھی بتایا جو اردو سے جا پانی میں کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں میں چند برس پیشتر احمد ندیم قاسمی کی معرفت دیکھ کا تھا کہ ”سنانا“ اور ”پرمیشور سنگھ“ کے نام سے ان کے افسانوں کے جا پانی میں تراجم بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس کے بعد ہمیں کلام سنانے کے لیے کہا گیا جو اس لحاظ سے ایک مشکل مرحلہ تھا کہ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی اردو بہت کتابی نوعیت کی تھی اور شعر پڑھتے وقت یہ وہڑ کا بھی لگا رہتا تھا کہ نجانے ابلاغ ہو بھی رہا ہے یا نہیں اس کا ایک فائدہ البتہ ضرور ہوا کہ عامر بن علی اور مظہر دانش سمیت پانچوں مہماں شاعر دس منٹ میں بیڑے گئے۔

آخر میں طلبہ طالبات کو مہماںوں سے اردو زبان و ادب کے بارے میں سوال کرنے کے لیے کہا گیا۔ سوالات کا معیار بہت اچھا تھا اور اگر یہ نہیں پہلے سے تیار نہیں کروائے گئے تھے پھر تو بہت ہی اچھا تھا۔ شروع شروع میں اس بات پر ابھسن ہوئے کہ جب یہ اردو کے طلبہ

ہیں تو سویمانے نے ہمارے جوابات جاپانی میں ترجمہ کر کے کیوں نئے ہیں مگر بعد میں بتایا گیا کہ ان میں سے کئی طلبہ بھی چار سالہ کو رس کے پہلے سال میں ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے ہماری ادبی اصطلاحات سے پر اور تیزی سے بولی جانے والی اردو کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس پر پتہ نہیں کیوں مجھے انور مسعود کا وہ شعر بہت یاد آیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کاش کبھی کوئی انگریز میرے پاس ایک فارم لے کر آئے اور کہے کہ اسے پر کر دیجئے اور وہ فارم اردو میں ہو۔

ٹو کیو میں واپسی

اوسا کا سے ہمیں جاپان کی مشہور زمانہ ”بلٹ ٹرین“ کے ذریعے ٹو کیو آنا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے گولی کی رفتار سے چلتی ہے اس کی اوستر ففارتین سوکلو میٹرنی گھنٹے بتائی جاتی ہے۔ عامر بن علی نے بتایا کہ آج کل جس ٹرین پر کام ہو رہا ہے وہ اس سے دو گنی رفتار یعنی چھ سو کلو میٹرنی گھنٹے کے حساب سے چلا کرے گی۔ واضح رہے کہ یہ رفتار فوکر ناپ کی ہواں جہازوں کی حد رفتار سے بھی زیادہ ہے۔

اب مسئلہ یہ آپڑا کہ دوپہر کا کھانا کب کہاں اور کیسے کھایا جائے کہ اب تو سہ پہر بھی ڈھلا چاہتی ہے کسی ”اپنے“ ناپ کے ریستوران کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ خاصے فاسٹے پر ایک ذیلی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایسی ایک جگہ ہے لیکن یہ طبیعتیں کہاں سے اپنی مطلوبہ بلٹ ٹرین مل سکے گی یا نہیں۔ خاصی بحث کے بعد ایک مقامی پاکستانی دوست کی رہنمائی میں ایک تیرے سے دو غیر یقینی شکار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور زیر فیصل آبادی کو پابند کیا گیا کہ وہ اگلی گاڑی کے چیچپے چیچپے چلے۔ اب یہ بات اس کی ڈرائیوری اور راستہ شناسی کی صلاحیت کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھی۔ چنانچہ سارے سفر میں اس نے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یقیناً جاپان میں قابل دست اندازی پولیس ہوں گے۔ اسٹیشن کے سامنے واقع ایک بڑے سے راؤنڈ اباؤٹ کے کئی چکر لگانے کے بعد بال آخر ہم لوگ ایک ٹنگ سی سڑک پر واقع ایک پارکنگ میں داخل ہوئے۔ زیر کا خیال تھا کہ اگر قیادت اسے سونپی جاتی تو ہم کم از کم میں من کے فالتو سفر سے بچ جاتے پتہ نہیں کہاں سے ایک بھولا بھٹکا شعر دھیان میں گونج اٹھا۔

بھکلنے والوں کو کیا فرق اس سے پڑتا ہے
سفر میں کون سڑک، کس طرف کو جاتی ہے

اس چھوٹے سے انڈین ریستوران کا نام ”علی بابا“ اور مالک ایک پاکستانی لڑکا تھا جس کا اعلقہ کراچی سے تھا۔ دوپہر کے وقت کے بعد ریستوران ابھی ابھی کھلا تھا چنانچہ وقت میں نوجوان باور پیٰ تندور پیٰ ویٹر مینٹر اور مالک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر زیر کی رُگ کار کر دیگی پھر ٹکٹھی اور اس نے سارا انتظام فوراً اپنے ہاتھ میں اس طرح لے لیا کہ کچھ دیر بعد ہوئی والا اس سے

ہدایات لینے لگا۔ بھوک کی شدت اور گرم کھانے میں قدرت نے یہ عجیب کمال رکھا ہے کہ وقت طور پر اس سے ذات کی حس زائل ہو جاتی ہے چنانچہ ابتدائی چند لمحوں میں وہ نوجوان امیر مطیخ اور تمام کھانے ”کوب کا دستِ خوان“ لگے البتہ جب خلال کا وقت آیا تو اندازہ ہوا کہ سب سے بہتر چیز تازہ سلااد اور اس کے ساتھ آنے والی چیزیں ہی تھیں۔

ابتدائی پروگرام یہ تھا کہ زیرِ نہیں بلکہ ٹرین پر سوار کر کے واپس آیا تو یاما اور عامر بن علی نیا گاتا چلا جائے گا جہاں اس کے کاروں کے کاروبار کا مرکزی دفتر ہے گرفتاریش پر پہنچا کر بلکہ ٹرین پکڑنے کے لیے نہیں جاپاں کے سابق صدر مقام اور تاریخی شہر کیونٹو جانا ہو گا اور عامر کو زیر کے ساتھ واپس تو یاما جانا پڑے گا کیونکہ یہاں سے اس کی منزل کا راستہ بہت چیخ دار اور لمبا ہے۔ کیونٹک کی مسافت صرف میں پچھیں منٹ کی تھی چنانچہ ہم مجاہر تا پک جھکنے میں وہاں پہنچ گئے۔ ریلوے سٹیشن کا ماحول ہوائی اڈوں جیسا تھا ہم نے تو کیوں جانے والی بلکہ ٹرینوں کی روائی کے اوقات دیکھے تو معلوم ہوا کہ آئندہ ایک گھنٹے میں چھڑیں یہاں سے ٹوکیو جا رہی ہیں جن میں سے پہلی آٹھ بج کرنو منٹ اور دوسرا آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہو گی جا پانیوں نے اس ٹرین کا نام ”زوہی“ رکھا ہے جس کا اردو میں قریب ترین متبادل ”خیال“ ہے یعنی یہ ٹرین خیال کی طرح تیز رفتار ہے۔ ملک حبیب الرحمن اور مظہر داش نے لکھت خریدے اور ہم اس نام کی معنویت کی داد دیتے ہوئے متعلقہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ہماری بوگی کا نمبر سول تھا۔ پلیٹ فارم پر ہر بوگی کے رکنے کی جگہ اس کے نمبر کے حساب سے درج تھی تاکہ مسافروں کا جھوم نہ ہو اور لوگ اپنی اپنی بوگی کے رکنے کی جگہ کے سامنے کھڑے ہوں۔ یوں ٹرین کے رکنے پر متعلقہ بوگی کا دروازہ مسافروں کے میں سامنے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے میں سو ڈیڑھ سو کے قریب مسافر چڑھتے اور اترتے ہیں اور دھرم پل تو کیا کسی کا کندھا بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوتا۔ ہم ابھی تیرہ نمبر بوگی کے رکنے کی جگہ پر تھی کہ ٹرین آگئی۔ مظہر داش نے بتایا کہ ہم یہاں سے داخل ہو کر اندر اندر چلتے ہوئے سولہ نمبر بوگی تک پہنچ سکتے ہیں سو بسم اللہ تکبھے۔

سولہ نمبر بوگی میں ہمارے نمبروں والی چار سٹیشن تو خالی تھیں مگر ایک پر ایک تیس سے ساٹھ سال کی کسی بھی درمیانی عمر کی خاتون بھی تانے سورہ تھی۔ یہ پہلی لا قانونیت اور بے ترتیبی تھی جو جاپاں میں نظر آئی۔ ہم نے سوالیے نظروں سے میر کاروبار ملک حبیب الرحمن کی طرف دیکھا مگر وہ کبھی نکلوں اور کبھی بوگی کے دروازے پر جاپانی زبان میں لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بولے لگتا ہے ہم غلط ٹرین میں بیٹھ گئے ہیں۔ یہ آٹھ بج کر نو منٹ والی گاڑی ہے جبکہ ہمارے پاس سوا آٹھ بجے والی گاڑی کی نکشیں ہیں۔

ایسے لگا جیسے بلکہ ٹرین کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی ہو ملک صاحب نے اپنی تھکی ہوئی آواز کو مزید بخاتے ہوئے کہا کہ وہ کسی متعلقہ بندے سے مل کر اس سماں کا حل دریافت کرتے ہیں اچھی بات یہ ہوئی کہ دونوں ٹرینیں ٹوکیو جا رہی تھیں سو ہمیں بتایا گیا کہ یہ ٹرین قریباً چالیس منٹ بعد ”نا گویا“ کے سٹیشن پر رکے گی ہمیں چاہیے کہ وہاں اتر کر چھو منٹ بعد اس ٹرین میں سوار ہو جائیں جس کی نکشیں ہمارے

پاس ہیں۔ معلوم ہوا کہ کیوں اور کیوں کے درمیان یہ تین صرف دو جگہ رکتی ہے پہلا نٹاپ ناگویا ہے اور دوسرا یوکوہاما۔ ناگویا کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہاں ٹولوناکاریں بنتی ہیں۔

محمد شام نے اپنی سیٹ کے سامنے لگی ٹرے نہایت کھولی اور روز نامہ "جنگ" کے لیے اپنا آج کا کالم "ٹوکیو سے ایک خط" لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اس سے پہلے صرف اطہر شاہ خان عرف جیدی کو اس طرح بھری محفل میں اس قدر یکسوئی کے ساتھ لکھتے دیکھا ہے۔ ناگویا کے نٹاپ کی آمد کے اعلان کے ساتھ محمد شام نے کاغذ سینئنے شروع کر دیے۔ معلوم ہوا "خط" لکھا جا چکا ہے تین بدلنے کے چھ منٹ اگرچہ میں سے نکال دیئے جائیں تو عطا کے خراثوں کو با آسانی "مسلسل" کہا جاسکتا ہے۔ سفر میں اس کی Instant نیند کا یہ عالم ہے کہ بھی کبھی تو وہ سیٹ میں بیٹھنے سے پہلے خدائی شروع کر دیتا ہے۔

ٹوکیو کے ریلوے اسٹیشن سے ہمارے ہوٹل کا فاصلہ اتنا کم تھا کہ اسے فاصلہ کہنا بھی زیادتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ پلیٹ فارم سے نکل کر سڑک کی تو بائیں پا تھوہ بھلی ہی سڑک کے کونے پر وہ دو خواتین نظر آگئیں جو روزانہ شام کو ہمارے ہوٹل کے گرد دونواح میں غالباً ہوا خوری کے لیے آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے حب معمول ہماری طرف ایک خیرگائی کی مسکراہٹ پھینکنا چاہی مگر ملک جیب الرحمن نے انہیں کچھ الیکی سرزنش بھری نظروں سے دیکھا کہ وہ گھبرا کر اس ریستوران کی طرف چل پڑیں جہاں ہم پکھو دیر بعد کھانے کے لیے جانے کا پروگرام بنارہے تھے۔ غالباً اسی کو پرانے لوگ "حسناتفاق" کہا کرتے تھے۔

جاپان، جو ہی چاولہ اور پروفیسر کتابوں کا

۱۳ جون کا دن دائتو بنا کیا یونیورسٹی کے لیے مخصوص تھا جس کے شعبہ اردو کے انجمن اردو کا کا تعارف میں پہلے کروا چکا ہوں۔ یہ یونیورسٹی ہماری رہائش گاہ سے تقریباً دو گھنٹے کے فاصلے پر تھی۔ منتظمین نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ یہ سفر انڈر گراؤنڈ تین کے ذریعے کیا جائے کہ اس طرح نہ صرف مسافت کم پڑے گی بلکہ یہ زیادہ بآہولت بھی رہے گا۔ لیکن شاید حساب کتاب کے وقت یہ نہیں دیکھا گیا کہ درمیان میں دو دفعہ ترین بدلتی بھی پڑے گی اور صبح کے وقت بھوم بھی زیادہ ہو گا۔ سو ہوا یہ کہ عطا کو سالہا سال کے تجربے اور مہارت کے باوجود سونے کا موقع نہ مل سکا اور میں اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ سٹیشن آنے سے دو سینٹ پہلے تک بظاہر مرائب میں غرق ہمارے جا پانی ہم سفر کس طرح چشم زدن میں ایسے ہوشیار اور تازہ دم ہو جاتے ہیں جیسے نیند بھی ان کی آنکھوں میں تھی ہی نہیں۔

ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ آج صحیح کا ناشتہ پاکستان ایسوی اسٹیشن کے دفتر میں تو یاما سے آئے ہوئے ملک ممتاز اور عزیزی مظہر دانش کی مشترکہ چیش کش تھا۔ ذبل روٹی کے پیس غالباً ہاتھیوں کو سامنے رکھ کر کائٹے گئے تھے کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان کی اوسط موٹائی ذبڑھ سے دو اخنچ تھی اور سائز بھی ایسا "جمبونما" تھا کہ ایک ٹوٹ سے پوری پلیٹ بھر جاتی تھی۔ آملیٹ جیسے زبان حال سے چیخ چیخ کر

اعلان کر رہا تھا کہ اس کے تیار کنندگان نے یہ کام تجرباتی بنیادوں پر کیا ہے اور یہ کہ وہ اور جو بھی بن جائیں باور پچی بھی نہیں بن سکتے۔ ہمارے ان خوش دلائی تبریزوں کا سب سے زیادہ مزہ ملک ممتاز نے لیا کہ وہ بنیادی طور پر ایک سپورٹس میں مزاج کا شخص ہے جو دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی بنانے کی حرمت اگیز اور خوبصورت صلاحیت رکھتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے بے غرض محبت کرنے والے لوگ اب زیادہ تر پر دلیں ہی میں ملتے ہیں۔

اب اس سے پہلے کہ بات بے مہری ار باب ڈلن کے گھر ہائے گردہ در گردہ کے غبار میں گم ہو جائے ہم واپس دا ستو بکا یونیورسٹی کے نزدیکی ریلوے سٹیشن پر چلتے ہیں جس کے قریب سے یونیورسٹی کی بسیں ذرا ذرا سے وقفے کے بعد مسلسل چلتی رہتی ہیں۔ دور سے دیکھا تو بس شاپ پر کوئی سو سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں بظاہر بے ترتیبی سے کھڑے تھے۔ ان کی عمروں اور اپنے پاکستانی تجربے کے حساب سے اس جمعیت کو چھیننے کے لیے کم از کم آدھ گھنٹہ در کار تھا جس کے دوران ایک آدھ لڑائی جھکڑا معمول کی بات ہے لیکن ہمارے وہاں پہنچنے تک دو دو منٹ کے وقفے سے تین بسیں آئیں اور بغیر کسی حکم پیل اور شور شرابے کے بس شاپ تقریباً خالی ہو گیا اور ہم اگلی بس میں ایسے اطمینان سے سوار ہوئے جیسے اسے خاص طور پر ہمارے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہمارے مطلوبہ شاپ تک پہنچنے کے دوران بس دو جگہ رکی بہت سی سواریاں اتریں اور چڑھیں لیکن بے حد مستعد ہونے کے باوجود کسی کی باذی لینگوں میں جاریت اور شدت نظر نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں طلبہ امتحان کی تاریخیں آگے بڑھانے یا کورس کم کرنے کی بجائے زیادہ اور بہتر تعلیم کی فراہمی کے لیے احتیاج کرتے ہیں اور وہ بھی اس سلیقے سے کا آدمی عیش عش کراچے۔

یہ مظہر دانش کا علاقہ تھا کہ وہ استادی سے پہلے یہاں شاگردی بھی کر چکا تھا اور اس کی جاپانی یقیناً اس کے رفقائے کارکی اردو سے بہتر تھی۔ ہمیں ایک لمبے چوڑے برآمدے میں ایک سائیڈ پر بنی ہوئی کچھ سنگی کرسیوں پر بٹھا کر وہ بذریعہ موبائل پروفیسر کتاڈ کی موجودہ پوزیشن کا پتہ کرنے لگا جس نے فون پر اسے بتایا تھا کہ سابقہ پروگرام کے مطابق اب براہ راست شعبہ اردو میں جانے کے بجائے پہلے ہماری ملاقات یونیورسٹی کے ایک ڈائریکٹر سے کرائی جائے گی جو بخلاف عہدہ و انس چانسلر سے ملتی جاتی کسی پوزیشن پر فائز تھا۔ عطا کو یہ تبدیلی اس لیے زیادہ پسند آئی کہ ہمارا عارضی پڑا اور پوری یونیورسٹی کے ان چند مخصوص حصوں میں سے ایک جگہ تھا جہاں سگریٹ نوشی کی اجازت تھی۔ سواس نے جلدی جلدی اس اصول کے مطابق سگریٹ پیا جیسے اونٹ اپنے کو ہان میں پانی کا ذخیرہ کر لیتا ہے۔

چند ہی لمحوں میں پروفیسر کتاڈ کا اپنے مخصوص شر میلے انداز میں ہستے اور پھر کی کی طرح گھوم گھوم کر مخصوص جاپانی انداز میں کو نشیں بجا لاتے ہوئے تشریف لے آئے اور انہوں نے ایسی بامحاورہ مسح اور مدققی اردو میں ہماری آمد کا شکریہ ادا کیا کہ ہماری اردو ان سردار جی کی طرح ہو گئی جن سے لکھنو کے کسی صاحب نے جب یہ پوچھا کہ

”حضرت قبلہ سردار صاحب کیا یہ حقیر پر تقدیر جناب والا کا اسم گرامی پوچھ سکتا ہے؟“ تو سردار صاحب نے گھبرا کر جواب دیا تھا۔
”پوچھو۔“

پروفیسر کتاڈ کی معیت میں ہمارا قائد جب ڈائریکٹر صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہوا تو مظہر نے بتایا کہ پروفیسر صاحب اپنے مہمانوں کے دس منٹ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے بہت فکر مند تھے کیونکہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ ہائی وے پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔
میں نے کہا۔ ”صحیح ہمارے سامنے تو تم نے انہیں بتایا تھا کہ ہم لوگ بذریعہ ٹرین آرہے ہیں؛ پھر؟“ مظہر دانش نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات پریشان ہونے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہائی وے کے ذکر سے ایک بڑا مزیدار لطفہ دہرا دیا گیا جو کچھ یوں تھا۔“

”ایک بزرگ موڑوے پر گاڑی چلاتے ہوئے جا رہے تھے کہ موبائل پر ان کی نیگم کا فون آیا۔ انہوں نے میاں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد سمجھا نے کے انداز میں کہا کہ گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا، ابھی ریڈ یو پر خبر آئی ہے کہ کوئی بے وقوف موڑوے پر ون وے کی خلاف ورزی کرتا ہوا جا رہا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔“ بڑے میاں نے تیزی سے سٹرینگ گھما یا اور کہا۔ ”ایک نہیں سارے ہی کم بخت ون وے توڑتے ہوئے آرہے ہیں۔“

پروفیسر کتاڈ کا بڑے مہمان نواز معالمہ فہم اور فنا فی الاراد و شخص ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی حس مزاح بھی بہت عمدہ ہے چنانچہ یقین کامل ہے کہ وہ اس لطفے کو لطفیہ ہی سمجھیں گے ورنہ بعض احباب تو کسی کی کھانسی کو بھی اپنے اوپر ٹھیک بھجھ لیتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے بتایا کہ پاکستانی طلباء اساتذہ اور دانشوروں کے لیے ان کی یونیورسٹی کے دروازے کھلے ہیں اور وہ اس ضمن میں ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہیں ہم نے بھی جواب ایسے ہی خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کیا اور تو قع ظاہر کی کہ مستقبل قریب میں کئی نئے شعبوں میں پاک جاپان تعاون کی راہیں کھلیں گی۔

مظہر دانش نے پروفیسر کتاڈ کا کے دفتری کمرے کی اس قدر تعریف کر رکھی تھی کہ اب اس کی زیارت ایک طرح سے ہم پر واجب ہو چکی تھی۔ اب جو دیکھا تو جیسا ساتھا اس سے کچھ بڑھ کر پایا کہ اس میں آگے پیچھے دمیں باعیں اور پر نیچے ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات چند بھارتی اداکاروں کی بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں تھیں جو ان کتابوں کے اوپر یو اروں کے ساتھ گلی تھیں۔ زیادہ تر تصویریں جو ہی چاولہ کی تھیں جس کے ذکر پر کتاڈ کا صاحب اس طرح شرماتے تھے کہ ان کا چہرہ لال اور جسم بے تال ہو جاتا تھا، ہم نے انہیں جو ہی چاولہ کے ہر جائی پن کے کچھ سنے نئے اور فرضی کئی طرح کے قصے سنائے مگر ان کی ہنسی کی گرم جوشی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ ہماری کسی بات نے ان کے جذبہ پسندیدگی پر ذرہ برا بر بھی اثر نہیں کیا۔ ان کا رو یہ اس نوجوان عاشق جیسا تھا جسے

اس کے باپ نے اس کی محبوب کے کئی منفی خصائص بتائے مگر اس کی ایک ہی رستھی کر میں نے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ لگ آ کر اس کے باپ نے کہا کہ میرے پاس کچھ ثبوت ہیں کہ اس لڑکی کا گاؤں کے ہر لڑکے کے ساتھ معاشرہ چکا ہے۔ نوجوان عاشق نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا۔ ”پھر کیا ہوا ابا، چھوٹا سا تو ہمارا گاؤں ہے۔“

ایک طرف مادھوری ڈکٹ کی بھی ایک تصویر رکھی تھی۔ میں نے کہا اس کے جملہ حقوق تو مصور ایف ایم حسین نے محفوظ کر کے ہیں اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ کتاڈ کا صاحب نے تو اس بات کا جواب نہیں دیا مگر ان کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ اس لیے جنگ کی طرح محبت میں بھی یکنہذ پیغض لائن ضروری ہوتی ہے۔

یہ تو خیر نہیں مذاق کی باتیں تھیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مشق خواجہ مرحوم کی گھر بیلو لاہبریری سے قطع نظر پر و فیسر کتاڈ کا کے اس کرے میں موجود اردو کتابیں شاید ہی تعداد کے اعتبار سے کسی اور شخص کی ذاتی لاہبریری میں موجود ہوں۔

جاپان کی لاہبریری میں اردو کتابیں

پروفیسر کتاڈ کا کے شعبے کا نام جنوب مشرقی ایشیائی زبانوں کا شعبہ ہے اردو ان میں سے ایک زبان ہے چنانچہ ہم جس کلاس میں لے جائے گئے اس میں بھارت بھانست کی زبانیں بولنے اور سیکھنے والے ایک ہی چھت کے نیچے جمع تھے۔ تعارفی کلمات کے بعد پروفیسر کتاڈ نے بتایا کہ اب وہ طلبہ و طالبات کو ایک ایسا میوزک و یڈ یو دکھائیں اور سنوائیں گے جس کی زبان وہ نہیں جانتے لیکن اس کا جو تاثران کے دل و دماغ پر ہو گا اسے وہ پہلے سے دیئے گئے کاغذوں پر دو تین جملوں میں بیان کریں گے جن کا ترجمہ کر کے ہم مہماں کو سنا یا جائے گا کہ وہ بھی اس مشق سے لطف انداز ہو سکیں۔ اس وقت ہماری حیرت کی انتہا رہی جب تھی وہی سکرین پر نصرت فتح علی کی ایک ایسی قوالی دکھائی گئی جو غالباً جاپان ہی میں کہیں ریکارڈ ہوئی تھی۔ نصرت فتح علی کی صحت اور دیگر قرآن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اس کی وفات سے دس بارہ برس پہلے کا کوئی پروگرام تھا۔

جن پچھیں تیس طلبہ و طالبات نے اپنے تاثرات قلمبند کئے ان میں سے تقریباً ۹۰ فیصد نے اسے ایک روحانی تجربہ اور ایک ایسی کیفیت قرار دیا جس کا تعلق مابعد الطیعتاں سے ہے اور بعض نے تو اپنے شاعرانہ جملوں میں اظہار خیال کیا۔ محمود شام ایک سنہ ہی چادر بطور تجدید پیش کرنے کے لیے لائے ہوئے تھے۔ وہ انہوں نے کتاڈ کا صاحب کو پہنانے کے بجائے اس طالبہ کو پہنادی جس نے سب سے اچھا جملہ لکھا تھا، جو کچھ یوں تھا۔

”اس موسیقی کو سن کر روح پر مسی ہی چھا جاتی ہے۔“

اگلا پروگرام لاہبریری کا دورہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں بارہ لاکھ کے قریب کتابیں موجود ہیں اور مختلف فلور پر بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی اتنی

گنجائش ہے کہ بیک وقت ایک ہزار سے زیادہ طلبہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لاہبریری کے عملے کے پچھا افراد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں لاہبریری کی نوعیت، تاریخ اور طریق کار کے بارے میں کچھ مطبوعہ مواد بھی پیش کیا اور مختلف سیکھشہ بھی دکھائے۔ غالباً پھٹے یا ساتوں فلور کی شیشے کی دیوار سے نیچے جھانکا تو من جملہ دیگر بہت سی چیزوں اور عمارتوں کے ایک مصنوعی جھیل بھی نظر آئی گزشتہ وہنوں سے محمود شام تقریباً ہر ملنے والے سے یہ سوال کر رہے تھے کہ جاپان میں اتنی زیادہ خودکشیاں کیوں اور کیسے ہوتی ہیں اور ان کے صحیح اعداد و شمار کہاں سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی جھیل کو دیکھ کر جو پہلا سوال انہوں نے ہماری رہنمایا تون سے کیا وہ بھی تھا کہ کیا اس جھیل کو لوگ خودکشی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو اس کی تفصیل کہاں سے مل سکتی ہے۔ رہنمایا تون ایک بے چاری سیدھی سادی سی لاہبریرین تھی جس کی انگریزی جس کی انگریزی بھی واجبی تھی سوکنی دیر تک تو اس کی سمجھ میں یہ سوال ہی نہیں آیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے پروفیسر کتاڈ کی طرف دیکھا جو اپنے مخصوص انداز میں پہلے جھکے پھر ہنسے اور پھر لہرائے اور بڑے وثوق سے جواب دیا کہ یہاں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ محمود شام نے اپنے سوال کا دائرہ جھیل سے پھیلا کر پوری یونیورسٹی تک بڑھا دیا لیکن ان کا سوال قلمیں گنوں کی چک اور تصویریں کھینچنے والوں کی ”ریڈی“ اور ”سائل پلیز“ کی آوازوں میں کھو گیا جو ہماری لاہبریری کی اس وزٹ کو محفوظ کرنا چاہ رہے تھے۔

بیشتر کتابیں جاپانی زبان میں تھیں سو ہم زیادہ سے زیادہ ان کے سرورق اور جلد بندیوں کی تعریف ہی کر سکتے تھے۔ پروفیسر کتاڈ کا نے مشورہ دیا کہ ہمیں زبان و ادب اور بالخصوص اردو کی کتابوں والا سکشن دیکھنا چاہیے، جو عمارت کے تہہ خانے میں واقع تھا۔ سائنس، میکنالوجی اور دیگر جدید علوم کے مقابلے میں زبان و ادب اور سو شش سائنسز کی کم قیمتی کا تو ہمیں پہلے سے اندازہ تھا لیکن ان کی بے وقعتی اور پستی کی عملی صورت حال یقیناً افسوس ناک اور غور طلب تھی۔ لاہبریری کے عملے نے ایک بند الماری نما چیز کو دو تین دفعہ گھما کر کھولا تو اندر سے شیل ف در شیف رکھی ہوئی اردو کتابیں سامنے آگئیں۔ مجلس ترقی ادب اور پچھا اور اداروں کی شائع کردہ کلاسیکی ادب سے متعلق کتابوں کے ساتھ ساتھ دو تین سو کتابیں جدید ناول، افسانے، تنقید اور شاعری کی بھی رکھی تھیں جن میں سے بیشتر سنگ میل پبلی کیشنز کی شائع کردہ تھیں۔ اتفاق سے جو شیل بالکل ہمارے سامنے تھا اس میں سے میری چند کتابیں آنکھوں میں ترے پہنچنے اپنے لوگ وقت، پہنچنے بات نہیں کرتے وغیرہ بھی تھیں۔ مظہر و انش نے ریک سے نکال کر یہ کتابیں ہماری رہنمایا لاملاہبریرین کو دکھائیں اور کتابوں کے پیچھے چھپی میری تصویریں دکھا کر بتایا کہ ان کا مصنف اس وقت یہاں موجود ہے۔ اب تو جناب ان کی حالت دیدنی تھی۔ انہوں نے انتہائی اشتیاق سے ایک دوسرے کو کتابوں پر چھپی تصویریں دکھا کر میری طرف متوجہ کیا اور پھر تیزی سے میری طرف اشارہ کر کے پروفیسر سے مزید جھک جھک کر پچھا باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے ان کتابوں پر دستخط کروانا تھا جسے ہیں کہ مصنف کی دستخط کی ہوئی کتاب ان کے لیے

ایک قسمی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی فرمائش کی تجھیل کے دوران بارہا میرے دل میں ایک پرانا سوال پھر سے ابھرا کہ کب وہ وقت آئے گا جب دنیا اردو زبان میں لکھے گئے عظیم ادبی سرمائے سے آشنا ہوگی اور جان سکے گی کہ اس کا ماضی کس قدر شاندار حال کیسا واقعیت اور مستقبل کتنا درخشان ہے۔

لاجبری سے فارغ ہو کر ہم شعبے کے ایک دفتر نمائمرے میں آئے جہاں ہم تینوں نے پروفیسر کتاڈ کا کو یونیورسٹی لاجبری کے لیے اپنی کچھ کتابیں پیش کیں ہر کتاب کو صول کرنے کے بعد پروفیسر کتاڈ کا اظہار تشکر کے لیے رکوع کے انداز میں اتنی بار جھکتے کہ انہیں روکنا مشکل ہو جاتا۔ کتاب اور اہل ادب کی تکریم کا یہ منظر اس بات کا شاہد ہے کہ زندہ قوموں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر کتاڈ کا نہیں کتابی شکل میں جاپانی ترجمہ شدہ اردو کی کچھ تحریریں دکھائیں جن میں سے کچھ تو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن منشو کی "گورنکھ سلسلہ کی وصیت"، غلام عباس کی "آنندی" اور پروفیسر کتاڈ کا کے کئے ہوئے فیض اور غالب کے تراجم پہلی بار نظر سے گزرے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے ایک جاپانی لنسل نو مسلم خطاط پروفیسر فواد کا تعارف نامہ اور مصورانہ خطاطی کے شعروں پر مشتمل بروشور بھی ہمیں دیا اور دکھایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عالمی شہرت کے حامل اس مصور کے کام کی نمائش عذریب پاکستان میں ہونے والی ہے۔ میں اس کا فتحی محکمہ کرنے کی پوزیشن میں توبیخ ہوں لیکن ایک ناظر کی حیثیت سے یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فواد کا کام منفرد بھی ہے اور اعلیٰ بھی۔

دوپھر کے کھانے کا میز بان مظہر دانش کا ایک پاکستانی تاجر دوست ایجاز رفیق تھا جو بڑے صبر سے ہمارے فارغ ہونے کا انتفارکر کر رہا تھا۔ نشی مورا شوبے اور اس کا ایک اور جاپانی ہم جماعت بھی ساتھ ہو لیے کہ وہ مہمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر اپنی اردو بول چال بہتر بناتا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش اس لیے تھیک طرح سے پوری نہ ہو سکی کہ اس دوران میں محمود شام کو پاکستان سے موبائل پر اوپر تلتے کئی کالزاں آئیں جن میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ "جگ"، "گروپ" کے کون کون سے اہم کالم ہگار انہیں چھوڑ کر "ایک پریس"، "خبریں" اخبار میں چلے گئے ہیں۔

سامی تامہ میں ایک دن

داسٹون کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طالب نشی مورا شوبے کے بارے میں مختلف حوالوں سے ذکر ہوتا رہا ہے لیکن اس سے صحیح معنوں میں ملاقات گذشتہ را اپنی لاہور کے باسی جمیشید کے رستوران میں ہوئی جہاں ہم سب دوپھر کے کھانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس کے ساتھی طالب علم کا نام توڑہ بن سے نکل گیا ہے بس اتنا یاد ہے کہ وہ جمیشید کی تیار کی ہوئی ہر چیز کو جھکھنے کے بعد طرح طرح کے منہ بناتا تھا اور اس کا چہرہ سامنے رکھے سلااد میں پڑے ٹھاٹر کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ نشی مورا شوبے کے مقابلے میں اس کی اردو انتہائی کمزور تھی اور وہ

زیادہ تر ”جی ہاں“ اور ”جی نہیں“ سے کام چلاتا تھا۔ جمیل ایک خوش رہا اور ہنس مکھ نوجوان تھا اور انہارہ سال سے غریب الوطن ہونے کے باوجود خوش نظر آتا تھا ہمیں اس کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ اس کی پاکستانیت تھی جس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ اس نے ہوٹل بنس کی کار و باری مصلحتوں کی پرواکے بغیر دروازے کے ساتھ صرف پاکستانی جنڈا لگا کر کھاتھا۔

نشی مورا شوبے نے یہاں بھی اپنے محبوب موضوع یعنی جنوں بھتوں اور تعویذ دھاگے کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھی اور بتایا کہ جاپان میں بھی بیشتر لوگ جادوٹوں نے پر یقین رکھتے ہیں اور یہاں بھی ”ذوب پیروں“ کا کار و بار خوب چلتا ہے۔ کھانا ذائقے اور معیار کے اعتبار سے تو درمیانہ ساتھا مگر جمیل کا نان بائی خاصاً کاریگر آدمی تھا اس نے ہمیں ہر سائز، مکمل اور ذائقے کے حامل نان کھلانے اور خوب خوب داد پائی کہ حاضرین میں سے بیشتر لوگ ”خوارک شناس“ واقع ہوئے تھے۔

خوارک شناسی کے ذکر سے مجھے اپنے ایک دوست کے بڑے بھائی یاد آگئے جو زندگی کا ہر کھانا آخری کھانا سمجھ کر کھایا کرتے تھے ایک بار شدید گریبوں کے موسم میں بریانی کھانے کے دوران ان کی تکمیر پھوٹ گئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ دوستوں نے سب مر وجہ علاج آزمائے مگر ان کی حالت میں کوئی افاق نہ ہوا، مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ہسپتال شافت کر دیا جائے اب جو انہیں رکھنے میں سوار کرنے کی کوشش کی گئی تو انہیں ہوش آگیا اور انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جو جملہ کہا وہ اپنی مثال آپ ہے، بولے۔

”مجھے کہیں نہ لے جاؤ، مجھے پڑھ چل گیا ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور اب میں نہیں پھوٹ گا تم ایسا کرو مجھے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی بریانی ڈال دو۔“

ہمیں گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ جاپان کا قدیم اور اصلی نام Nippon (نی پن) ہے اور یہ کہ اس کا اصل کلچر اور فن تعمیر دیکھنے کے لیے ہمیں سابقہ دارالخلافہ اور قدیمی شہر کیوٹو ضرور جانا چاہیے کہ اگر چٹو کیوٹو اور کیوٹو میں بظاہر صرف حروف کا الٹ پھیر ہے مگر یہ جاپان اور نی پن کی طرح ایک ہی قوم اور تاریخ کے مختلف رنگوں کے علم بردار ہیں۔

تحوڑی دیر بعد سروں میں جمیل کے ساتھ ایک جاپانی لڑکی بھی شامل ہو گئی جمیل نے اس کا تعارف دیکھ کر طور پر کروایا لیکن ہمارے مقامی دوستوں کا خیال تھا کہ یہ اس کی مقامی بیوی ہے کیونکہ یہ ایک طرح سے وہاں کا مسئلہ راجح الوقت ہے ہم لوگ البتہ آخر تک تذبذب میں رہے کیونکہ اس عفیفہ کی مسکراہیں سب کے لیے ایک جیسی تھیں۔

معلوم ہوا کہ اس علاقے کے سورزٹو کیوٹی نسبت کم مہنگے ہیں اور پھوٹ کے کپڑوں کی خریداری کے لیے یہ انتہائی موزوں جگہ ہے جب سے میری بیٹیاں صاحب اولاد ہوئی ہیں میری زیادہ تر شاپنگ ان کے پھوٹ سے ہی متعلق ہوتی ہے انسانی زندگی کا یہ پہلو انتہائی دلچسپ اور عجیب و غریب ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی ترجیحات خود بخوبی بدلتی چلی جاتی ہیں اور بعض اوقات آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہی لوگ جو

ایک زمانے میں ایک دوسرے کی خیر خبر پوچھا کرتے تھے کچھ برس بعد یہوی بچوں کا حال احوال دریافت کرنے لگتے ہیں اور پھر یہ معاملہ ایک دوسرے کی بیماریوں اور ڈاکٹروں کے ناموں کی پرش تک محدود ہو جاتا ہے۔

جاپان نے اپنے آپ کو چند صنعتوں تک محدود کر کے ان پر ایک طرح کی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے مگر بہت سے شعبوں میں اس کا انحصار درآمدات پر ہے جن میں ملبوسات بھی شامل ہیں سوہاں کی مارکیٹوں میں چین، تھائی لینڈ، کوریا اور تائیوان کا کپڑا اور ریڈی میڈی ملبوسات چھائے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے قیمتی برائنا ناموں والے ملکے کپڑے پاکستان میں تیار ہو کر کی گئی قیمت پر یہاں اور پوری دنیا میں بکتے ہیں لیکن ان پر پاکستان کا نام نہیں ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی کام اگر پاکستان میں کیا جائے تو اسے چوری اور دو نمبر کا طعنہ سہنا پڑتا ہے۔

رات کا کھانا سائی تامہ میں ہی ایک پاکستانی ہوٹل "اکرم" میں رکھا گیا تھا جس کے مالک محمد اصغر سے اگرچہ ہم پہلے بھی پاکستان ایسوی ایشن کے دفتر میں ایک لمحہ پر مل چکے تھے مگر اس وقت وہ دیگر پر بطور "ورتارا" بیٹھا تھا اس لیے اندازہ نہ ہوا کہ وہ نفس نقص کی ریستورانوں کا مالک ہے اور یہ بیرا گیری صرف اپنے پاکستانی مہمانوں کی محبت اور احترام میں کر رہا ہے۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ "اکرم" ریستوران قریباً ایک سو کلو میٹر کے دائرے میں رہائش پذیر تمام پاکستانیوں کی جائے ملاقات اور ایک طرح کا ڈی رے ہے جہاں تلاش معاش کے گرداب میں چکراتے ہوئے اہل وطن کچھ دیر کے لیے ستابکتے ہیں کہ یہاں اصغر نے ان کے لیے ایک چھوٹا سا پاکستان بنارکھا ہے یہاں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں سے قطع نظر پہلی بار کچھ ایسے احباب ملے جو ادب سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان میں سے کچھ کا مطالعہ قابلِ رشک حد تک اچھا تھا۔

اصغر نے سب میزیں کر سیاں ہٹا کر ایک فرشی نشست کا اہتمام کر کھا تھا مہمانوں کو ایک قدرے بلند جگہ پر بٹھایا گیا جو بیٹھنے کے لیے تو تلک تھی مگر وہاں کے ماحول اور احباب کی محبت نے اس تلکی میں ایک ایسی وسعت اور گنجائش پیدا کر دی تھی کہ ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی بے آرامی کا احساس نہیں ہوا۔ بہت سے سامعین کو ہم مہماں شعراء کا کلام پہلے سے یاد تھا سو ان کی فرمائشوں کی تعییل میں کھانا اپنے مقررہ وقت سے کوئی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا لیکن دستِ خوان پر سندھی بریانی، پائے پاک کے ساگ اور لا ہوری مرغ چنوں کی موجودگی اس بات کی گواہ تھی کہ اصغر نے مہمانوں کو پاکستانی ماحول دینے کے لیے کتنی محنت کی ہے اس نہس کھکھ اور مہماں فواز شخص کی ایک اور ادائے ہمیں بہت متاثر کیا مقامی احباب نے بتایا کہ اصغر ہر یوم پاکستان عید میلاد النبی اور عاشورے کے دن صبح سے شام تک پاکستانیوں کو بلا تخصیص مفت کھانا پیش کرتا ہے اور یہ لئنگر صبح سے رات تک چلتا رہتا ہے۔

پاکستانی جہندوں سے بھرے ہوئے اس محب وطن اور زندہ دل انسان اصغر کے ریستوران سے نکلتے نکلتے رات کے بارہ بج گئے۔

عزیزی عرفان صدیقی اپنے ایک دوست علی اور اس کی بڑی سی گاڑی کو لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا کہ کب ہم فارغ ہوں اور کب وہ ہمیں نوکیوں کی ایسی سیر کرائے جس کے لیے وہ ہماری جاپان آمد کے وقت سے لے کر اب تک بے چینی سے موقع تلاش کر رہے تھا۔

رات دو بجے کے قریب ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچتے تو ایک نیا اور چھپ مسئلہ ہمارا منتظر تھا۔ میں نے شروع میں شاید کہیں لکھا بھی ہے کہ جاپان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والے بہت کم ہیں اور بعض اوقات یہ لوگ ایسی جگہوں پر بھی کمیاب ہوتے ہیں جہاں ان کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ سو ہو ایوں کہ ہم نے فرنٹ ڈیک والوں سے اپنے کروں کی چابیاں طلب کیں تو انہوں نے کسی اندر ونی کرے سے ایک ایسے شخص کو بلا یا جوان کے خیال میں انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا اس مرد شریف نے بڑے اطمینان سے بتایا کہ ہماری پہلی بکنگ ختم ہو چکی ہے اور اب ہمیں نئے سرے سے بکنگ کرا کے پہنچلی کرنا ہوگی۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی گئی کہ ہمارا سامان ان کروں میں پڑا ہے اور ہمیں یہاں ابھی مزید دو دن قیام کرنا ہے۔ سو اگر اس معاملے میں کوئی ابھمن ہے تو آپ صحیح ہمارے میزانوں سے بات کر لیجئے گا کہ اس معاملے کی تفصیلات ان کے اور آپ کے درمیان ہیں مگر وہ بندہ خدا اپنی ضد پر اڑا رہا تھا آکر ہم نے اسے مطلوب ادا گئی کر دی۔ اس دوران میں ملک جبیب الرحمن سے فون پر بات ہو چکی تھی سو وہ کچھ ایسے غضب ناک انداز میں وار ہوئے کہ ”کس شیر کی آمد ہے کہ رن کا نپ رہا ہے“، کامنٹر آنکھوں میں گھوم سا گیا۔ ان کی تھکی ہوئی آواز اس وقت ایسی گونجی اور چکنی کہ ہوٹل کے عملے کو جان بچانا مشکل ہو گیا ملک صاحب نے بربان جاپان ان کی وہ خبری اور ان کے اپنے ریکارڈ سے ہماری بکنگ کو اس طرح ثابت کیا کہ ان سب کو اپنی نوکریاں خطرے میں نظر آنے لگیں۔ انگریزی والا آدمی تو فوراً ہی بھاگ گیا اور باقیوں کے جھکنے کا یہ عالم تھا جیسے تیز بارش کا رکھا ہوا پرفل سپینڈ پر چل رہا ہو۔

ہیر و شیما کی کہانی

۱۵ جون ہر اعتبار سے ہمارا جاپان کے اس دور کا آخری دن تھا کہ اگلے دن صحیح ہماری فلاٹ تھی ہمارے ہوٹل ائیر پورٹ تک کا فاصلہ ایک گھنٹہ کا تھا جو ٹریک کی وجہ بڑھ بھی سکتا تھا۔ سو عامر کے برادر بزرگ عبدالحسین نے (جو عمر کے اعتبار سے بزرگ تو کیا ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے) اپنے تجربے اور داشت سے کام لیتے ہوئے ہماری اس رات کی بکنگ ائیر پورٹ کی حدود میں واقع ہالی ڈے ان میں کراوی تھی تاکہ ہم جہاز چھوٹ جانے کے لئے اس پریشانی سے فتح جائیں جو میری ناپسندیدہ ترین چیزوں میں سے ہے۔

سات دنوں میں یہ پہلا ناشتہ تھا جسے ”ناشتہ“ کہا جا سکتا تھا کیونکہ ”اکرم“ کے اصغر نے رات کو تقریب کے اختتام پر کھانے کا بہت سا سامان اس طرح ملک جبیب اینڈ کمپنی کے پرد کر دیا تھا جیسے باراتیوں کے ساتھ کھانے کی دلگیں بھجوائی جاتی ہیں اس سے ایک بار پھر اس احساس میں شدت پیدا ہوئی کہ بیرون وطن ڈالر پاؤ نڈریاں اور ین کمانے والے ہمارے بھائی غیر ملکوں میں کس اذیت اور عذاب میں

زندگی گزارتے ہیں اور بظاہر بے شمار سہوتیں ہونے کے باوجود اپنی مرضی کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے انہیں کتنی تگ و دوکرنی پڑتی ہے اور وطن میں چھوٹی چھوٹی اور عام انترا نے والی خوشیاں کیسے بڑی اور غیر معمولی بن جاتی ہیں۔

درمیانے قد اور چھوٹی سی داڑھی والے زیر صاحب ہم وقت وید یوریکارڈنگ میں مصروف نظر آئے اس لیے ان سے باضابطہ ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اب پتہ چلا کہ وہ الیکٹر انکس کے شعبے میں خصوصی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف عالمی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ عراق، ایران جنگ اور اس کے بعد عراق پر امریکی حملے کے دوران بھی محااذ پر موجود رہے ہیں اور انہوں نے کسی کے آنکھ سے ایسے ایسے مناظر فلم بند کئے ہیں جو اگرنا یاب نہیں تو کمیاب ضرور کہے جاسکتے ہیں ان کا اصرار تھا کہ ہم ان کے پروگرام اردو نیٹ کے لیے انٹرو یوریکارڈ کروائیں۔ اس اردو نیٹ کے بارے میں جو تفصیلات انہوں نے بتائی تھیں وہ میرے ذہن میں بالکل گذہ ہو چکی ہیں یوں بھی کمپیوٹر سے متعلقہ معاملات میں، میں کم علم ہی نہیں تقریباً بے علم ہوں۔ سو میں اس پروگرام کی تفصیلات سے اس اصول کے تحت صرف نظر کرتا ہوں جس کی ایک شکل ہمارے پیارے مرحوم بزرگ سید ضمیر جعفری نے اس لازوال شعر کی صورت میں پیش کی ہے۔

وہ تو خاموش ہیں جہالت سے لوگ انہیں فلسفی سمجھتے ہیں

زیر صاحب کے سوالات عام روشن سے ہٹ کر اس حوالے سے تھے کہ ہم تیسری دنیا کے ادیب، شاعر اور دانشور (یہ آخری اسم توصیف کچھ زیادہ ہی بھاری ہے) اپنے اردو گردکی دنیا کو کیسے دیکھتے اور اس کے مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اتفاق سے ٹوکیو یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے انہی کی گاڑی میں جگہ ملی سورتے میں بھی گفتگو کا موقع ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے اہل وطن غیر ملکی میڈیا کے سیالب میں اگرچہ تکنوں کی طرح میں لیکن اس کے باوجود جہاں اور جتنا موقع ملتا ہے پاکستان کے انجیج کو بہتر بنانے کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن ملڈریز تک کے سارے راستے میں بارش ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہی مگر مجال ہے کہ کسی سڑک پر پانی کھڑا نظر آیا ہو یا کوئی تریک لائن بند ملی ہو۔ اس حوالے سے کہی بارہ صیان وطن عزیز کی طرف گیا جہاں بارش کے حسن پر نگاہ ڈالنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے کہنی ستم فیل ہو جاتے ہیں۔

ٹوکیو کی اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے انجمن اسادا ہا گیتا صاحب کی شکل بہت جانی پہچانی لگی لیکن اس سے پیشتر کہ میں ذہن پر زور ڈال کر یہ یاد کر سکتا کہ ان سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟ انہوں نے سب سے پہلے تو مصافی کرتے وقت میر انام لے کر مجھے حیران کیا اور پھر فر فر ہماری گزشتہ ملاقات کا احوال اور تفصیلات کچھ اس طرح سنائیں کہ معاملہ پر یہاں کی حدود کو چونے لگا۔ زندگی میں کہی بارا یہے لوگوں سے ملاقات ہوتی جو کی یادداشت غیر معمولی تھی لیکن اسادا ہا گیتا کو اس گروہ کی پہلی صفت میں شامل کرنا چاہیے کہ انہوں نے مجھے دن

مہینہ سال وقت اور مقام سمیت یاد کرایا کہ ہم آخری بار شاعرہ اور پولیس آفیسر نیلامادرانی کے دفتر میں ملے تھے اور اس مختصر ملاقات میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ پروفیسر اسادا عام جاپانیوں سے قدرے زیادہ ہستے اور نسبتاً کم جھکتے تھے اور ان کی گفتگو میں امر کیوں جیسی بے تکلفی اور اعتماد تھا شاید اس کی ایک وجہ اس یونیورسٹی کا ماحول ہو جہاں بحث بحث بحث کی زبانیں اور کچھ چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔

پروفیسر اسادا نے بتایا کہ ان کے شعبے کے طلباء طالبات آج کل ایک سطح ڈرامے کی تیاری میں مصروف ہیں جس کا نام ”ہیر و شیما کی کہانی“ ہے اور جس کی تحریم نیشنل اور دنیا کو جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرنا اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار کرنا ہے۔

اس سے پہلے بھی وہ ایک کھیل پاکستان اور ہندوستان میں پیش کر چکے ہیں ہے، بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس بارہ وہ ایک ماہ کے لیے پاکستان کے تین شہروں کراچی لاہور اور اسلام آباد میں یہ کھیل پیش کریں گے۔ ہر شہر میں کل تین شو ہوں گے۔ لاہور میں ایک شوالا ہور کالج یونیورسٹی برائے خواتین کے ساتھ پہلے سے طے ہو چکا ہے۔ البتہ باقی دو شووز کے بارے میں وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں تعلیمی اداروں میں کیا جائے یا کسی ایسی جگہ جہاں ہر طرح کے لوگ انہیں دیکھے سکیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ یہ شو ہمرا آرت کو نسل کے ہال میں کریں جونہ صرف سہولیات کے اعتبار سے موزوں ترین ہے بلکہ وہاں مختلف طرح کے ناظرین بھی مہیا ہو سکتے ہیں اس پر اسادا نے میرے ساتھ وہی کیا جسے عرف عام میں ”جو بولے وہی کندھی کھولے“ کہتے ہیں۔ سو میں نے آتے ہی رینڈنٹ ڈائریکٹر لارڈ ہور آرت کو نسل اصغر گلائی صاحب سے یہ بات کی اور پروفیسر اسادا کو بذریعہ ای میل اطلاع دی کہ وہ ہمرا کے ہال نمبر دو میں تیرہ چودہ اور پندرہ تبر کی بنگ کے لیے رسمی درخواست براہ راست آرٹس کو نسل کو بھجوادیں تاکہ فائل کا پیٹ بھرا جاسکے۔

”ہیر و شیما کی کہانی“ کی ڈرامائی تھکیل پیش کش میں سطحِ کرافٹ ساونڈ اور لامگ کے حوالے سے جدید شیکنا لوچی استعمال کی گئی ہے۔ پروفیسر اسادا نے بتایا کہ فی الوقت ان سب چیزوں کا انظام ممکن نہیں تھا اس لیے ان کے طلباء کا ایک حصہ رینڈنٹ ڈائریکٹر اے کے انداز میں پیش کریں گے جس کا مقصد مغضّہ ہمیں اس کے موضوع اور انداز سے روشناس کرنا ہے۔ سو دس بارہ لڑکے اور لڑکیاں ایک لائن میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہمیں اس کھیل کا ابتدائی سین بول کر سنایا۔

بعض اداکاروں بلکہ صد اکاروں کی اردو حیرت انگیز حد تک صاف تھی اور الجھ بھی بہت عمده تھا البتہ بیشتر کے لمحے کا جاپانی پن چھپائے نہیں چھپ رہا تھا اور شاید یہی اس کی خوبصورتی بھی مجھے یقین ہے کہ پاکستانی ناظرین اس کھیل کی روح سے متاثر اور اس کے انداز سے بے حد لطف انداز ہوں گے۔

”ہیر و شیما کی کہانی“ کے حوالے سے بات اردو ادب میں ”ہیر و شیما“ کی استعاراتی پھیلاؤ اور اس کے گرد بننے گئے افسانوں اور نظموں کی طرف جانکلی اور ہم کتنی دیر احمد ندیم قاسمی صاحب کے مشہور افسانے ”ہیر و شیما“ سے پہلے اور ہیر و شیما کے بعد، پر بات کرتے

رہے۔ اس وقت کے معلوم تھا کہ جب اس دن کی روئیدادِ کمی جا رہی ہوگی تو وہند لکے میں داخل ہو چکا ہو گا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! کل من علیہما فان!

اللّهُ قَدْمٌ

۹ سے ۱۶ جون تک کے سفر جاپان کی رواداد پہلیتے پہلیتے "ساتواں در" کے چودہ کالموں پر محیط ہو گئی ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ "جناب" کے قارئین نے نہ صرف اسے پسند کیا ہے بلکہ سیاسی مسائل سے بھرے سنجیدہ تبصروں پر مشتمل کالموں کی اس آنکھشان میں اسے ایک وکھری ٹائپ کا روشن اور پسندیدہ ستارہ قرار دیا ہے اور آئندہ کے لیے بھی فرمائش کی ہے کہ جب کسی سفر پر جا گیں تو اس کی رواداد ضرور لکھیں۔

توبات ہو رہی تھی تو کیوں نیورسٹی برائے فارن سٹڈیز کے شعبہ اردو کے تیار کردہ ڈرامے ہیر و شیما کی کہانی کی جو عنقریب کراچی اسلام آباد اور لاہور میں بھی پیش کیا جائے گا۔ ڈرامے کے بعد تینوں مہمانوں کی گفتگو اور شاعری کا دور چلا اور اس کے بعد طلبہ کے سوالات کا ایک سیشن رکھا گیا۔ شاید یہ طلبہ کے پیش کردہ ڈرامے کا اثر تھا کہ زیادہ تر سوالات ڈرامے سے متعلق ہی کئے گئے اور تقریباً سمجھی کا مجھے ہی جواب دینا پڑا۔ سوالات اگرچہ بنیادی نوعیت کے تھے مگر ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مخفی سوال برائے سوال نہیں تھی۔

یونیورسٹی سے نکل تو پھر وہی کھانے کا مسئلہ آپڑا کہ اس علاقے میں نہ تو کوئی پاکستانی ریستوران تھا اور نہیں کسی میکڈ و فلڈ یا کے ایف سی کی خبر ملی جہاں سے کچھ ایسی چیزیں مل جاتیں جنہیں پورے نہ کہی تھوڑے بہت اطمینان سے نوش جان کیا جاسکتا اور پر سے باش تھی کہ لگاتار ہوئے چلی جا رہی تھی۔ موبائل فون پر عالم کے بھائی یعنی عابد حسین سے مشورہ کیا گیا جو اس علاقے کو نسبتاً زیادہ جانتا تھا اور ہم سب اس کے بتائے ہوئے ایک ریستوران کی طرف چل پڑے جو اگرچہ فاصلے پر تھا مگر عابد کے بقول کھانے کے لیے کافی حد تک موزوں اور "محفوظ" تھا۔ خدا خدا کر کے وہاں پہنچ گئے تو معلوم ہوا کہ لیچ کا وقت ختم ہو چکا ہے اور ڈنر کا کاروبار ابھی شروع نہیں ہوا۔ سوسائٹے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ قریب ہی ایک اور محقول صورت مگر خالص امریکی انداز کی جائے خور دنوں نوش تھی ٹیلے پایا کہ اسی سے کام چلا جائے میتوکارڈ میں مختلف ڈشوں کی تصویریں بھی تھیں اور جاپانی اور انگریزی زبانوں میں ان کے اجزاء ترکیبی بھی درج تھے لیکن یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ جس ٹیلے میں انہیں بلا گیا ہے اس کا سلسلہ نسب کس کس جانور سے ملتا یا مل سکتا ہے۔

زیر اور ملک جبیب کی احتیاط پسندی اور جاپانی زبان میں مہارت کا نتیجہ یہ تلاکہ باورچی خانے سے شیف کو بلا کر تفصیل سے سمجھایا گیا کہ ہمارے اسلام کو خطرے سے نکالنے کے لیے اسے کن کن احتیاطی تدابیر سے کام لیتا ہو گا اتنے میں عابد حسین اپنے دوست رمضان صدیق کے ساتھ پہنچ گیا جو ٹوکیو میں پاکستانی ہولڈوں کی ایک چین کا ماں لک ہے اور خود انہی تیکوں کی اقسام کے بارے میں گہرا اور وسیع علم

رکھتا ہے۔ سواس نے ریستوران والوں کو اپنی زبان میں اس طرح سمجھایا کہ سب کے خدشات دور ہو گئے۔

کھانے کے بعد آکیا بارا جانے کا پروگرام تھا جہاں الیکٹر نکس کی بہت بڑی مارکیٹ ہے اور جس کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہاں پاکستان میں استعمال ہونے والی ولٹیج کے مطابق اشیاء ملتی ہیں ہم بظاہر اپنے اسچ کریم بخش نما جیسے نظر آنے والے ایک شور میں داخل ہوئے لیکن اندر پہنچ کر پتہ چلا کہ اس کے کوئی دس بارہ فلور ہیں اور ہر فلور پر الیکٹر نکس کی ایک ایسی دنیا آباد ہے کہ ہر شوروم پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتا ہے۔

ایک شوکیس میں بلڈ پریشر مانے اور جانچنے کے بے شمار آلات رکھے تھے۔ عطا کو جو پسند آیا وہ کلامی پر گھٹری کی طرح باندھنے والا ایک آل تھا جو بیس سینٹر میں آپ کو بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ آپ کی ہارٹ بیس بھی بتا دیتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ ہدایت درج تھی کہ کلامی کو ایک مخصوص اور قدرے مشکل پوزیشن میں نہ رکھنے کی صورت میں اس کی ریڈنگ غلط بھی ہو سکتی ہے میں نے تین بار دکھائی گئی تصویر کے مطابق کلامی کو دل کے عین مقابل رکھ کر اپنا فشار خون ٹیسٹ کیا مگر ہر بار تفاوت نکلا کہ میں نے ملک ممتاز کے مشورے پر ایک نسبتاً آسان اور قدرے روایتی انداز کے آئے کو ترجیح دی جس کی ریڈنگ صحیح ہو یا نہ ہو تسلی بخش ضرور تھی۔

آڑیوی ڈی پلیسٹ کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ چوتھے فلور پر جانا ہو گا وہاں پہنچنے تو عقل دنگ رہ گئی کہ ڈی پلیسٹ کی اتنی ورائیتی کی ختم ہونے میں نہ آتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں سے ۹۹ فیصد نوجوان نسل کے شوق کے مطابق ڈیزائن کئے گئے تھے اور انہیں ہیڈفون کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا اور جو ایک فیصد میری پسند کے تھے ان کا سائز خاصاً بڑا تھا اچانک ملک ممتاز نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بہت کیوٹ سائی ڈی پلیسٹ شاید ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں نے اسے پہلی نظر میں ہی او کے کر دیا۔ دوسرا خوشی یہ ہوئی کہ اس کی قیمت بھی نہایت معقول تھی۔

بیگم صاحبہ نے فون پر جا پانی چیولری کی فرمائش کی تھی۔ مابدنے بتایا کہ سڑک کے دوسری طرف ایک متعلقہ شور ہے تو سبھی لیکن اس بارش اور ٹریفک میں سڑک پار کرنا تھوڑی سی بہت مانگتا ہے۔ میں نے اسے اکبرال آبادی کا "لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے" والا شعر پکھو وضاحتی مثالوں کے ساتھ سنایا تو اس نے فوراً مجھے اپنی چھتری کے سائے میں لے لیا۔ اور ہم دونوں بقول گلزار آدھا آدھا بھیلتے ہوئے سڑک پار کر گئے، لیکن ہماری یہ ساری دلاوری اکارت گئی کیونکہ وہ سوراب وہاں نہیں تھا اور اس کی جگہ ایک سرراہ نائپ چائے خانہ بن چکا تھا جو اس وقت ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ کھانے کا انظام رمضان نے اپنے ایک ریسٹورنٹ میں کیا تھا جو جدائی کے لمحوں کی مخصوص ادا سی کے سائے میں کھایا گیا کہ کچھ دیر بعد ہم مہمانوں کو اپنے میز بانوں سے وداع ہوتا تھا۔ امتیاز گو ندل خاص طور پر تو یا ما سے اسی مقصد کے لیے آئے تھے اور ان سب کا ارادہ ہمیں ہمارے ہوٹل تک پہنچانے کا تھا مگر جب حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اسی پورٹ یہاں سے ڈیزائن

گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور اگر ہم اس تکلف میں پڑ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہمیں سونے کے لیے وقت نہ مل سکے گا بلکہ ہمارے یہ محبت والے میزبان بھی ساری رات سڑکیں ناپتے رہیں گے سو بڑی مشکلوں سے انہیں اس بات پر راضی کیا گیا کہ سب کی بھلاکی نہیں سے جدا ہو جانے میں ہے۔ باہر نکلے تو بارش نیم تاریکی اور جلدی میں اس فیصلے پر عمل درآمد تو ہو گیا مگر دو تین دوستوں سے الوداعی مصافی اور معافی کہیں بیچھے ہی میں رہ گیا۔

ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کی بس ہمیں لے کر روانہ ہوئی تو اس وقت بھی بارش ہو رہی تھی۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ محمود شام اپنے دوست عرفان صدیقی کے ہمراہ اس کے گھر چلے گئے تھے جہاں سے اگے دن انہیں جاپانی حکومت کا مہمان بتنا تھا اور اب پھر واپسی کے سفر میں عطا اور میں ہی رہ گئے تھے۔ اس بارائیر پورٹ پر ہمیں ٹوکیو سے بنکاک اور بنکاک سے لاہور تک کے دونوں بورڈنگ کارڈ ایک ساتھ دے دیئے گئے سامان چونکہ لاہور تک بک ہو چکا تھا اس لیے اب ہمارے پاس تھوڑے تھوڑے دستی سامان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بنکاک ایئر پورٹ اس بار اس قدر جانا پچھانا لگا کہ ہم بغیر کسی سے پوچھنے سیدھے مساج پارلر میں پہنچ گئے اور تھائی لوگوں کے اس آرٹ سے خوب خوب لطف انداز ہوئے کہ وہ مسافروں کی ساری ٹھکنے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے جیسے بدن سے کھینچ کر نکال دیتے ہیں۔ عطا کا خیال تھا کہ بچیہ چار گھنٹوں کے لیے وہیں کمرہ کرائے پر لے کر آرام کیا جائے مگر میں نے ایئر پورٹ پر گھونٹنے پھرنے کو ترجیح دی اور یوں ایک ڈیوٹی فری شاپ سے مجھے کچھ بہت اچھی کتابیں بھی خاصی معقول رعایت کے ساتھ مل گئیں جن میں سے ایک میں نے عطا کے خراؤں کے باوجود لاہور چکنچنے سے پہلے ختم کر دی۔

ایئر پورٹ پر برادر مسعود چیمہ ہمارے انتظار میں کھڑے تھے انہوں نے ہماری روائی کے دن ہی واپسی کا وقت اور فلاٹیٹ نمبر نوٹ کر لیے تھے۔ ایک بار دل پھر اللہ کی رحمتوں کے شکر سے بھر گیا کہ کس طرح وہ ہمیں ایسے بے شمار مہربانوں کی محبتوں سے نوازتا ہے جن سے بعض اوقات چند لمحوں سے زیادہ کی ملاقات بھی نہیں ہوتی۔ کشمکش کے ڈیوٹی انچارج محسن رفیق نے بہت آؤ بھگت کی اور چند لمحوں بعد جب میں اپنی تیکم فردوں اور بیٹے ذیشان سے ملا تو یوں لگا جیسے یہ سارے اسفر سات دن کا نہیں سات منٹ کا تھا۔



جس دلش میں گزگا بہتی ہے

کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل ہزاروں میں دور سمندر پار بننے والی قوموں کے بارے میں جتنا کچھ جانتی ہے اس کا عشرہ عشیرہ بھی اسے چند میل کے فاصلے پر بننے والے ان لوگوں میں بارے میں معلوم نہیں جن کے ساتھ ان کی مشترک تہذیب اور تاریخ کی داستان کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

گو وال نہیں پہ وال سے نکالے ہوئے تو ہیں
کبھے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اگر اس صورت حال کو آج پر منطبق کیا جائے تو اگرچہ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بُوارے سے پہلے ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ بھی گزارہ تھا اور اس سے کی اگر کچھ ناگوار یا اس تھیں تو کچھ خونگوار احساسات بھی تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ٹھنڈا اور باورچی خانے کی تقسیم کے بعد ہم لوگ زیادہ اچھے ہمایوں کی طرح رہتے کہ یہ تقسیم جھکڑا نہیں بلکہ جھکڑے کا حل تھی۔ مگر بدسمتی سے ان باسٹھ برسوں میں دونوں ملکوں کے عوام نے فیصلے کا اختیار اپنے اپنے سیاست دانوں کو دے دیا اور وہ ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتے چلے گئے۔ فسادات میں جو کچھ ہوا وہ دیوالگی کے ایک فوری عمل کی داستان تھی یا یہ بارودی سرنگیں ہمارے اجتماعی مااضی کے راستوں میں پہلے سے دبی ہوئی تھیں۔ اس پر ایک بے نتیجہ گفتگو آئندہ کسی صدیوں تک ہو سکتی ہے مگر ہمارے نزدیک اس کا ایک انتہائی اہم پہلو انگریز حکمرانوں کی "Divide and Rule" (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کی پالیسی یقیناً تھی جس نے صدیوں پر محیط ایک جزے ہوئے معاشرے کے منفی عناصر کو اتنی ہوا دی کہ ایک معقول سطح کا Intimate Relationship ایسا بگزا کہ ہم لوگ اسے ایک Working Relationship کی شکل میں برقرار رکھ سکے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

یہ دیوالگی نہیں تو اور کیا ہے کہ دونوں طرف سے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ "سرکن کے پھٹ رہے ہیں"، کچھ طحیک سے نہیں کہا جاسکتا کہ پاک بھارت تعلقات (کم از کم عوام کی حد تک) میں یہ حال یہ گرم جوٹی امر یکدی کی تابعداری کا نتیجہ ہے۔ میدیا کی آزادی کی وجہ سے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کی فراوانی کے باعث ہے یا کچھ مجھ دونوں ملکوں کے

لیڈروں نے اس صورت حال کی روز افزوں تجھنی کا اندازہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں ہی عناصر اس تبدیلی کا باعث بنے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے کچھ ایسے اساب بھی ہوں جو ابھی تک واضح اور روشن نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایک مستحسن صورت حال ہے جسے محاورتاً ”دیر آید درست آید“، بھی کہا جاسکتا ہے وہ لوگ جو اسے شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ خوشی منانے یا لذیاں ڈالنے سے منع کر رہے ہیں انہیں بھی اس کا حق ہے کہ دودھ کا جلا چھا چھا بھی پھونک کر پیتا ہے اور ماٹھی کے بہت سے تجربات بھی ان کے حق میں جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ایک سابقہ کھلاڑی ہونے کے ناتے سے ہی ہے کہ ہر بال کو اس کے میراث پر کھینا چاہیے سو ہمیں مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ یہ منافقت سے پاک ہو گی۔

گزشتہ برس بھارت میں سات دن گزارنے کا تجربہ بہت خوشنگوار تھا کہ حکومت اور عوام دو توں سطحوں پر محبت کے دعوے اور اظہار ہو رہا تھا۔ اس باراً گرچہ بھارت کی حکومت بدلتی ہوئی تھی اور اس کی پاک بھارت پالیسی میں بھی وہ گرم جوشی نہیں رہی جو پہلے تھی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کے باوجود عوام سے عوام کے رابطوں اور باہمی تعلقات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور بقول شخence یہ وہ جنم ہے جو بوقت سے باہر آگیا ہے اور اب اسے واپس بوقت میں ڈالنا خود اس کے آقاوں کے بس میں بھی نہیں رہا۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے دوست اور فلم ادب اور موسیقی کی دنیا سے تعلق رکھنے والے پاکستانی احباب کے جانے پہچانے اور محبوب گلزار صاحب اپنی ادبی گرو اور بابا احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے پاکستان آئے تو ان کے ساتھ ایک زیر تحریک پاکستانی میوزک ایم کے کچھ ویڈیو یوز بنانے کی بات چل جس کے پروڈیوسر برادر عزیز یونس چوہدری ہیں جو موسیقی کے عاشق اور دیوانے ہیں اور جو الیکٹر انک سازوں کے بے ننگم شور بے سرے گدکاروں بے سرو پاشا شاعری اور راؤں کی بنیاد سے آزاد کپوزیشنز کے اس طوفان میں ساز، آواز اور الفاظ کا ایک ایسا گلدستہ بنانے کے خواہاں ہیں جس کا ہر پھول اصلی اور خوبصوردار ہو اور جس کی ساخت اور پرواخت نہ صرف اپنی مٹی میں ہو بلکہ اسے ”سیمیکلز“ سے بھی محفوظ رکھا جائے۔ میرے غریب خانے پر اس وقت تک تیار دوریاں نگز انہیں سنوائیں گے اور ملے پایا کہ نگنٹو کا اگلا سیشن میں ہو گا جس میں مطلوب تفصیلات ملے کی جائیں گی۔ ابھی ہم لوگ پروگرام بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ دہلی سے ساپتہ اکیڈمی والوں کی دعوت آگئی کہ وہ ۱۸ تا ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء ”اردو کی نئی بستیاں“ کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کر رہے ہیں اور مجھے اس کے ایک اجلاس کی صدارت کرتا ہو گی۔ اس دعوت نے نہ صرف یہ مسئلہ حل کر دیا بلکہ میری تیگم کی ایک دیرینہ خواہش کی تحریک کا رستہ بھی نکل آیا کہ اسے انڈیا کی بھی دعوت نامہ منگوایا گیا تاکہ ویزے میں سہولت ہو سکے۔ وزارت خارجہ کے احباب برادرم اشرف قریشی اور سلیم عباس گیلانی کی محبت اور توجہ سے بھارتی سفارت خانے کے ویزا سیشن کی پیدا کی ہوئی کچھ اڑپنیں بروقت دور ہو گئیں اور یوں ہمیں ایک میئنے کا دہلی، آگرہ لکھنؤ اور ممبئی کے لیے پولیس رپورٹ سے مستثنی ویزا مل گیا۔

یونس صاحب اور ان کے صاحبزادے عزیزی خرم کو ان کے کسی سیاستدان دوست نے ویزادلانے کا وعدہ کیا تھا۔ سو طے پایا کہ ہم لوگ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ۲۲ مارچ کو بھلی میں اکٹھے ہو جائیں گے۔

دوست احباب کو پیش کرنے کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تخفے خریدنے نکلے تو ایک اطیفہ بہت یاد آیا، آپ بھی سن لجئے۔

ایک صاحب بھلی بار کسی دوست کے گھر جا رہے تھے دوست نے بڑی تفصیل سے راستہ اور پتہ سمجھایا اور آخر میں کہا۔ ”دروازے کی بیل دائیں ہاتھ پر لگی ہے اسے کہنی سے دبادینا۔“

ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ”کہنی سے کیوں۔۔۔۔۔ ہاتھ سے کیوں نہ بجاوں گھٹنی؟“

”وہ اس لیے کہ تمہارے دونوں ہاتھ تو جخنوں سے بھرے ہوں گے۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔“

لا ہور ایسیر پورٹ پر رضا عالی عابدی کا متبسم چہرہ ہمارا منتظر تھا ان کی آواز کی طرح ان کی مسکراہٹ بھی بہت خوبصورت ہے۔ رسم ابھی مسکرا بھی تو اچھا لگتا ہے اور اب تو برسوں کا تعلق بھی شامل حال تھا میں نے ان سے گلزار جاوید اور ناصر بغدادی کا اتنے پتہ پوچھا اور بولے۔ ”گلزار بھی نہیں پہنچے اور ناصر بغدادی صاحب کو میں صورت سے پہچانتا نہیں ہوں، ہو سکتا ہے یہیں کہیں ہوں ویسے اب تو اصلی بغدادی کی صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔“ کچھ دیر بعد ناصر بغدادی آئے تو گلزار نے ہم دونوں کے بالوں سے محروم مردوں کی طرف غور سے دیکھا اور پھر میرے کان میں آہتہ سے بولا۔ ”آپ دونوں تو ہم زلف نکلے۔“

لا ہور سے دہلی تک پرواز کا دورانیہ صرف پچاس مت تھا۔ تیک آف اور لینڈنگ کے بیچ ایک سینڈوچ بھر و قند تھا جو چائے کی پیالی سے پہلے ختم ہو گیا۔ ایگر یہ شہر میں پہنچنے تو مجھے یاد آیا کہ بچھلی بار انہوں نے پاکستانی مسافروں سے الگ سے ایک فارم (جس کی تین کاپیاں تھیں) بھروا یا تھا۔ بڑھتی ہوئی دوستی کے دعووں کے باوجود یہ ”خصوصی سلوک“، بھی تک جاری تھا اس اتنا فرق پڑا کہ گلزار کے ایک عزیز نے جو ایسیر پورٹ سے ہی متعلق تھا ایک کمرے میں بٹھا دیا اور ایگر یہ شہر کی ساری کارروائی وہیں پوری کرادی۔ سایہتہ اکادمی کی طرف سے ہدایت تھی کہ ہم ٹکسی لے کر اپنی معینہ قیام گاہ یعنی انڈین انٹرنسٹیشن سٹرپنچ جائیں کرایہ وہاں ادا کر دیا جائے لیکن ہمیں وہاں پہنچانے کی ذمہ داری برادرم عازم گروندر کو بھلی نے لے رکھی تھی جس سے ملتا جلتا چہرہ اس اس وقت کہیں دور دور تک دکھنیں رہا تھا۔

عازم کو بھلی سے میری بھلی ملاقات ۲۰۰۳ء تک ایک انتہائی وحدناک لوورات کو ہوئی جب وہ اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ ایک ایسی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آیا تھا جس سے متعلق رشتہ کئی نسلوں تک پھیلے ہوئے تھے کہ اس کے میزبان گھسن صاحب کی فیملی کے ساتھ اس کے بزرگوں کا دوستانہ بہت پرانا اور گہرا تھا جو قیام پاکستان یا بقول ان کے بنوارے کے بعد بھی جاری و ساری رہا اور دونوں خاندانوں کے افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہے ہیں۔ اس واقعہ سے چند ماہ قبل ای میل پر عازم نے مجھ سے رابطہ کیا میں کمپیوٹر

کے حوالے سے ناخواندہ ہوں میری میل میرا بینا علی ذیشان دیکھتا ہے اور اپنی صوابید کے مطابق پر نٹ کال کر مجھے دے دیتا ہے۔ میں با تھوڑے ان کے جواب لکھ دیتا ہوں جنہیں وہ مختلف احباب کو ای میل کر دیتا ہے اور یوں اس کمپیوٹر زدہ دنیا میں گزارے کی ایک شکل نکل آتی ہے۔ بوجوہ یہ ملاقات بہت مختصر تھی کہ چند گھنٹوں بعد عازم کو بذریعہ بس دہلی روانہ ہونا تھا اس وقت تک ابھی دونوں ملکوں کے درمیان پروازوں کا سلسہ بحال نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس بیگم (بینا بھائی) بھارتی کرکٹ منڈر سنگھ کی بہن ہیں اور خود عازم اردو پنجابی دونوں زبانوں میں صاحب کتاب شاعر ہیں۔ دہلی واپس جا کر اس نے اپنے سفری تاثرات پر بنی ایک نظم مجھے بھجوائی جس کا عنوان تھا ”کچھ دن
ٹھہر دے گے لا ہورا!

یہی نظم اصل میں ہماری دوستی کا نقطہ آغاز ہی کہ یہ ایک انتہائی خوبصورت سادہ اور دل کو چھوٹے والی نظم تھی جو بیانیہ انداز کی ہوتے ہوئے بھی سیاسی بیانات سے کوسوں دور تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میرا ایک مشاعرے کے سلسلے میں بھارت جانا ہوا تو دلی میں میری میزبانی کا حق عازم نے از خود حاصل کر لیا اور یوں اس سے دوستی اور مسلسل رابطے کا ایک ایسا سلسہ بن گیا کہ اس بار اس نے ہمیں صرف کافرنیس کے تین دنوں کی حد تک سایپاہ اکیڈمی کا مہمان بننے کی اجازت دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اسی پورٹ سے انڈیا انٹرنشنل سٹرپ پہنچانے کے لیے وہ اور بینا بھائی آئیں گے تاکہ ان کی بھائی یعنی میری بیگم کو بھارت کی سر زمین پر با قاعدہ خوش آمدید اور ”جی آیاں نوں“ کہا جا سکے۔ یہ تفصیل تھی اس اجھاں کی کہ اسی پورٹ پر خلاف موقع وہ لوگ موجود نہیں تھے۔ گزر ارجاد یہ کہ عزیز کے موہائل سے انہیں کال کی توپتہ چلا کر وہ پون گھنٹے سے ہمارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اب بھی میں آیا کہ گزر اک بھتیجا پر وٹوکول دینے کے جوش میں ہمیں ایک بغلی دروازے سے باہر لے آیا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ خیال آیا کہ شیخ سعدی نے کئی صد یاں قبل ایسی ہی کسی صورت حال میں کہا ہوگا۔

راہ راست برداگرچہ دور است

یعنی سید ہے راستے پر چلو چاہے وہ لمبا ہی کیوں نہ ہو۔

گزشتہ برس کی نسبت اس بارہ دلی کی سڑکوں پر ٹرینک کی بد نظمی نسبتاً کم تھی۔ معلوم ہوا کہ زیر زمین ریلوے سسٹم کا ایک حصہ مکمل ہو کر کام کرنے لگا ہے سو سڑکوں سے ٹرینک کا کچھ لوڑ کم ہو گیا اور اس دوران میں کچھ فلائی اور زیبھی مکمل ہو گئے ہیں جس سے ہر یہ سہولت ہو گئی ہے (اگرچہ بعد کے تجربات مختلف نکلے لیکن ان کا ذکر آگے آئے گا) انہیں انٹرنشنل سٹرپ کہنے کو ہمارے لاہور جنم خانہ کی طرح کا ایک کلب ہے لیکن نتو وہاں ہماری طرح انگریز کی یادگار یعنی نائی لگا کر آنے کا مپیکس اور پابندی ہے اور نہ ہی اس کا ممبر بننے کے لیے بہت بھارتی بنک اکاؤنٹ کی ضمانت درکار ہوتی ہے۔ یہ فنون لطیفہ سے کسی نہ کسی طرح متعلق لوگوں کا کلب ہے اور یہی اس کی الہیت کی واحد شرط ہے۔

ان کے طور طریقے دیکھ کر ایک بار پھر احساس ہوا کہ ان لوگوں نے بعض عمدہ اصول وضع کر کے اور پھر ان پر قائم رہ کر کس طرح ایک ایسا نظام اقدار بنایا ہے جس کی بنیاد انسانیت اور ہنر مندی پر ہے۔ ہماری طرح انہوں نے جا گیر داری، کالا صاحب اور فوجی بوت کو سر پر چڑھانے کے بجائی انہیں ان کی جگہ پر رکھا ہے۔ سواس کلب میں ہمیں یہ تینوں عناصر اور ان کے تازہ وارد ساتھی یعنی نو دولتیا کلاس والے بھی نظر نہیں آئے یا کم از کم ایسے لوگ نمایاں نہیں تھے۔ جس سے بھی بات کی اسے فنون لطیفہ کے کسی نہ کسی شعبے کی پہلی صفت میں پایا۔ اکثر اپنی بنیاد میں بڑے دردناک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت یاد آ رہا ہے۔ آپ بھی اس زہر خند میں شامل ہو جائیے۔

سینر شاعر شہزاد احمد راوی ہیں کہ ایک بار رائٹر گلڈ کے ایکشن ہو رہے تھے اس وقت کی برسر اقتدار پارٹی نے اپنا ووٹ بنک بڑھانے کے لیے اپنے من پسند آدمیوں اور غیر ادیب و مستوں کو بطور ادیب ممبر شپ دے دی اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب ان کے نام پڑھتے تو حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کون سے ادیب اور شاعر ہیں؟ میں تو ان میں سے بیشتر ناموں سے بھی واقف نہیں۔ اس پر شہزاد احمد نے کہا۔
”آپ خاطر جمع رکھئے ان میں سے بھی اکثر آپ کا نام نہیں جانتے۔“

بات کسی اور طرف نکل گئی خیر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں کیونکہ وطن عزیز میں اکثر باتیں کسی اور طرف نکل جاتی ہیں۔ کمرہ نمبر ۶۰ میں سامان رکھا اور سایپاہ اکیڈمی کے افسر مہمانداری سے آئندہ پروگرام کی تفصیلات حاصل کیں معلوم ہوا کہ پیشتر مندوب آچکے ہیں اور کچھ رستے میں ہیں لیکن آج کی شام اور رات کا کوئی خاص طے شدہ پروگرام نہیں۔ ڈنر کا انتظام نہیں ہے باقی آپ جہاں چاہیں، آئیں جائیں۔ عازم اور بھابی کا اصرار تھا کہ آئندہ تین دن آپ نے ہمارے قابو نہیں آتا اس لیے اس وقت ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔ رات گیارہ بجے واپس پہنچنے تو معلوم ہوا سوائے تلقی عابدی کے سب لوگ آچکے ہیں اور وہ بھی پہنچا چاہتے ہیں۔ عازم کو ہم نے ہمارے لیے پہلے سے ایک عدد موبائل فون کا انتظام کر کھاتھا جو سارے قیام کے دوران ہمارے پاس رہا ہم نے مقامی محاورے کے مطابق کچھ ایسے احباب کو فون ”لگائے“، جنہیں فوری طور پر اطلاع دینا ”خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم“ کی ذیل میں آتا تھا صلاح الدین پرویز سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دو بہنوئی گزشتہ چند مہینوں میں انتقال کر گئے اور خود وہ بھی انجیو پلاسٹی وغیرہ کے عمل سے گزر چکا ہے۔ سو میں نے پہلے تو تعزیت کی اور پھر اسے حوصلہ دیا کہ عارضہ قلب فی زمانہ بیماری نہیں بلکہ سٹیشن سمبل ہے۔

کافرنس کا افتتاحی اجلاس ۱۸ مارچ صحیح دس بجے سایپاہ اکیڈمی کے ہال میں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوئے پونے دس ہو گئے کہ بیرے اگر بہرے نہیں تو انہیں کوئی اور مسئلہ ضرور تھا کیونکہ روٹین کا ناشتہ (آلیٹ فرائی انڈے وغیرہ) لانے میں بھی انہیں کم از کم پندرہ منٹ لگتے تھے۔ میں نے آلو کا پراٹھا مگنولیا تھا سو اس کے دس منٹ اضافی سمجھ لیجئے۔ انڈوں کی تیاری کے سلسلے میں بیرے جس تفصیل سے ہدایت لیتے تھے اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ اس سلسلے میں اندر جا کر مرغیوں سے خصوصی اجازت لیتے ہیں۔ انڈوں کے حوالے سے

انور مسعود کا سنا یا ہوا ایک جملہ ہر روز ناشتے کی میز پر ایک نیا لطف دیتا تھا۔
بہونے ناشتے کے لیے اپنے سر سے پوچھا۔

”ابا جی! آپ کو انڈہ بنادوں؟“

”نه بیٹی تو مجھے بندہ ہی رہنے دے۔“ بزرگ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سامنہ اکیڈمی والوں کی بھجوائی ہوئی گاڑیاں تو بجے سے مندو بین کو کافرنس ہال میں پہنچا رہی تھیں اور ہمارا گروپ بالکل آخری تھا جس میں تلقی عابدی بھی شامل تھے انہیں چونکہ اس اجلاس میں بولنا بھی تھا اس لیے وہ بار بار اپنے مخصوص حیر آبادی تکلف کے ساتھ ساتھیوں کو تاخیر کا احساس دلا رہے تھے اس پر ایک دوست نے کہا، آپ ہمارے پاس ہوائی جہاز کے بورڈنگ کارڈ کی طرح ہیں کہ آپ کے بغیر جلد شروع نہیں ہو سکتا، سو خاطر جمع رکھئے۔ اس پر تلقی عابدی کچھ بولے تو نہیں مگر انہوں نے ایک ایسی Look دی جو زبان حال سے کہ رہی تھی۔ ”حال اورے ان پر چھوٹو“

اگرچہ ہم لوگ پورے دس بجے منزل مقصود پر پہنچ گئے مگر یہ دیکھ کر خفتہ ہی ہوئی کہ وہ گیر مہماں نوں سمیت پاکستان کے ہائی کمشنز عزیز احمد خان بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اچھے منتظم کی طرح یک وقت چوکس اور Relaxed نظر آئے۔ عزیز احمد خان حسب معمول تپاک سے ملے۔ وہ ایک مخفجہ ہوئے سفارت کا رہیں بھارت جیسے مشکل ملک میں وہ جس خوش اسلوبی سے پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ ہم نے ہر ایک کے منہ سے ان کی تعریف سنی۔ گزشتہ دنوں انہوں نے جس طرح گلزار صاحب کو احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے انتہائی مختصر وقت میں ویزہ فراہم کیا اس سے یقیناً پاکستانی سفارت خانے کی نیک نامی میں اضافہ ہوا ہے وہ نہ صرف پہلے سیشن میں شامل ہوئے بلکہ آخر تک موجود ہے۔ کافرنس ہال کچھ بھر ہوا تھا۔ بیرون بھارت سے جتنے لوگوں کو مدد کیا گیا تھا ان میں سے چند ایک ویزے کے مسائل علالت یاد گیر وجوہ کی بیان پر آنے سے رہ گئے جو پہنچ پائے ان میں لا اس ایجاد امریکہ سے نیز جہاں ان کے شوہر ذہانت صاحب، شاعر فتح شہزاد نیو یارک سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد بعین یگم، ردو ٹائمز والے خلیل الرحمن، بمع بیگم اور برادرم وکیل انصاری جبکہ واشنگٹن سے ڈاکٹر عبداللہ نور نو کینیڈ اسے ڈاکٹر تلقی عابدی، شکلیل رفیق اور اطہر رضوی، ماریش سے یا کمین بودی برطانیہ سے عبدالغفار عزم، صابر ارشاد عثمانی، رضا علی عابدی اور پاکستان سے ہم تینوں یعنی گلزار جاوید ناصر بغدادی اور یہ خاکسار آئے تھے۔ میری بیگم مندوب تو نہیں تھی پھر بھی اس نے کافرنس کا پیشتر حصہ ائمہ کیا لیکن کچھ اس طرح کہ بتول ساغر صدقیقی:

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یا وہ نہیں

غالباً ایسی ہی کیفیت گوفاری میں ”ذ جائے ماندن نہ پائے رفتُن“ کہا جاتا ہے۔

کافرنس کا آغاز سیکرٹری سایپہ اکیڈمی چید اندن کے انگریزی خطبہ استقبالیہ سے ہوا جو ملیام کے بڑے زبردست شاعر ہیں اور پچھلے دنوں ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ پاکستان بھی آئے تھے۔ یہ خطبہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اسے ہوتا چاہیے تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں خطبہ استقبالیہ کے بعض حصوں کے اجمالی کی تفصیل بیان کی اور مائیک نیر جہاں کی طرف بڑھایا جو جگت آپا ہیں اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی انہیں نیڑا آپا ہی کہہ کر بلا تے ہیں۔ انہوں نے بر صیرے باہر اور خصوصاً امریکہ بلکہ لاس اینجلس میں اردو کی ترویج و ترقی اور مسائل کے حوالے سے کچھ باتیں کہنے اور چلتے چلتے بغیر نام لیے ریحانہ قرپ بھی ایک جملہ جڑو یا جس کی ادبی منظر پر آمد نے کم از کم A.L.A کی حد تک ان کے مقابلے میں ایک اور ادبی پلیٹ فارم ضرور پیدا کر دیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر قی عابدی کی باری تھی۔ انہیں چونکہ اس کافرنس کے پیشتر اجلاسوں میں بولنا تھا اس لیے یہاں انہوں نے ہاتھ ہولا رکھا اور صرف اس کافرنس کی غرض و غایت اور اردو کی نئی بستیوں کی پیش آمدہ مسائل پر ہی گفتگو کی حاضرین میں سے جو لوگ فوری طور پر پہچانے جاسکے ان میں مشہور نقاد و اورث علوی (جنہیں کچھ دوست بے تکلفی میں فسادی نقاد بھی کہتے ہیں) خواجہ حسن ثانی نظامی ایوال کلام قاسمی ش.ب.ک. نظام مناظر عاشق ہر گانوی، بلال ج کوہل، سیفی سروجی، ڈاکٹر مظفر، ایاز مجید صدیقی، عبدالمنان طرزی، عزیز پریہار، عنبر بہراچی اور محمد زماں آزر وہ شامل تھے۔ کچھ احباب سے بعد میں تعارف ہوا جن کا ذکر حرب موقع آگے آئے گا۔ قرۃ العین حیدر تواب علالت کی وجہ سے گھر سے کم تکلتی ہیں مگر دہلی کے کچھ معجبر ادیبوں کو وہاں نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ شیم حتفی، عتیق احمد، شپور رسول، شاہد مہدی، زبیر رضوی اور خاص طور پر صلاح الدین پرویز کی عدم موجودگی بہت کھلکھلی۔ تصدیق کا موقع تو نہ سکا مگر سنایہ کیا کہ وہاں بھی ہماری طرح گروپ بندیاں عروج پر ہیں اور اگر چہ نارنگ بہت صلح کل اور معاملہ فہم انسان ہیں مگر پھر بھی شاید بقول تاشیر "کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔"

حیدر آباد سے بختی حسین کا فون آیا جو بائی پاس کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اس کے جوز کے ہاتھوں سخت پریشانی میں ہیں۔ گزشتہ تینوں سفروں کے دوران دہلی کے قیام میں ان کا بہت ساتھ رہا تھا سو اس بار ان کی کمی زیادہ محبوس ہو رہی تھی کچھ دیر بعد صلاح الدین پرویز سے رابطہ ہوا تو اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ بوجوہ جان بوجھ کرنیں آیا تھا کہ ادھر بھی آگینوں کو خیس گلی ہوئی تھی۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ لوکل مسائل میں کبھی نہیں الجھنا چاہیے کہ یہ کوئی لوگوں کی ولائی میں منہ کالا کرنے والی بات ہے اور اس سے سوائے بدناہی اور پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا سو میں نے اس موضوع کو چھیرے بغیر اس سے بات چیت کی۔ آج کل وہ لکھنے لکھانے کے علاوہ صرف سہ ماہی "استعارہ" نکالتا ہے اور غالب کے اس مصروع پر عمل پیرا رہتا ہے کہ "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

شام کو اس کے اپارٹمنٹ میں کنٹر کے شاعر شو پر کاش اور آل انڈیا ریڈ یو پر تقدید والے محمود باشی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں حضرات بہت پڑھے لکھے اور عالمی ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے ہیں۔ سوبات لاطینی امریکہ کے کلشن اور فلسطینیوں کی شاعری کے درمیان گروش

کرتی رہی۔ اس دوران میں کچھ شعرو شاعری بھی ہوئی اور ایک بار پھر احساس ہوا کہ بر صیر کی علاقائی زبانوں میں کتناز برداشت ادب لکھا جا رہا ہے مگر ہم اپنے مقامی ادب کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہمارے بیورو کریٹ اردو کے ساتھ کرتے ہیں کہ قول مشتاق احمد یوسفی:

”ہمارے بیورو کریٹ ناط اگلریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دیتے ہیں۔“

۱۹ مارچ کا نفرنس کا دوسرا دن تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کانفرنسوں کے ابتدائی اجلاس کے بعد حاضری ایک دم کم ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ ذرائع مختلف تھا۔ صرف گزشتہ روز کے سامعین اور مندو بین موجود تھے بلکہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آئے۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ افتتاحی اجلاس میں خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی بھی قدرے تاخیر سے شامل ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے تعلق کے باعث انہیں بھارتی مسلمانوں کا ایک اہم اور با اثر نمائندہ سمجھا جاتا ہے مگر شخصیت کے اعتبار سے بھی وہ ایک محنتی ملنگا اور جہاں دیدہ انسان ہیں اور مذہبی پروگراموں سے بھی زیادہ زبان و ادب کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں خوش طبع اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع انصاف بھی ہیں سو عمومی طور پر ہر جگہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے احمد مشتاق کی شاعری پر مقالہ پڑھنا تھا لیکن ان کی فرمائش کی وجہ سے مزید پابند ہو گیا جس کے نتیجے میں دو تین ایسے مقائلے بھی سننے پڑے جو اس روپ کی طرح وفادار تھے جس نے ماں کی ناک سے بھی اڑانے کے چکر میں اس کی ناک ہی اڑا دی تھی۔

احمد مشتاق گزشتہ کئی برس سے نقل وطن کر کے نیوجرسی امریکہ میں جا بے ہیں یہاں بھی ان کا شمار اپنی نسل کے نمائندہ شاعروں اور پاک ٹی ہاؤس کے مستقل بیٹھنے والوں میں ہوتا تھا، قدرے ہکلا کر بات کرتے تھے جس کے باعث مشاعروں سے گریز کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے بیشتر اشعار اہل ذوق کو زبانی یاد تھے اور ہیں۔

جی بھر آیا کاغذ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہو گئیں
رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یاد رفتگاں
پھول منگل ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

یہ لوگ نوئی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

ابوالکلام قاسمی کا مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور حسن ذوق کا مظہر تھا اور انہوں نے احمد مشتاق کے کچھ ایسے شعر بھی سنائے جو پرانے ہونے کے باوجود نئے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو صرف بہت اچھے شاعروں میں ہی پائی جاتی ہے۔ سناءب وہ گوشۂ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی بھی ان کا تازہ کلام شمس الرحمن فاروقی کے ”شب خون“ میں نظر آ جاتا ہے۔ ”شب خون“ کے ذکر سے یاد آیا کہ گزشتہ تقریباً چالیس برس سے یہ رسالہ اپنے مخصوص انداز فاروقی صاحب کی مدبرانہ صلاحیتوں اور اپنی اشاعت میں پابندی کے باعث اردو دنیا میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ہی اس کے تازہ شمارے میں مطبوعہ ایک اعلان سے پتہ چلا ہے کہ اس کا آئندہ شمارہ آخری شمارہ ہو گا کہ اپنے ایک سینئر ہم عصر ”افکار“ کی طرح اسے بھی بند کی جا رہا ہے۔ اگرچہ فاروقی صاحب نے اس اقدام کی وجہات بیان نہیں کیں مگر یہ کسی سے ڈھکی چچی بھی نہیں ہیں کہ اب سنجیدہ ادب سے ڈچپی رکھنے اور رسالہ خرید کر پڑھنے والے اس قدر کم ہوتے جا رہے ہیں کہ رسالے کو ایک ادبی مشن کے طور پر چلانا ممکن ہی نہیں رہا اور جہاں تک اشتہار دینے والوں کا تعلق ہے وہ بھارت میں ہوں یا پاکستان میں، ان کے نزدیک ادب ایک جزوی مشغل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بقول شخصے اب تو خود شاعر اور ادیب بھی رسالوں میں اپنی تحریر کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔ میرے خیال میں اب ایک کائفنس دونوں ملکوں میں اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ ادبی رسالوں کو کیسے زندہ رکھا جاسکتا ہے۔

دو پہر کے کھانے کے بعد جتنا بھابی بھی فردوس کو سینما ہال میں ”بلیک“ فلم دکھانے لے گئیں کہ اس کی نہ صرف وہاں بہت دھوم تھی بلکہ کیبل کے بہت سے چینلز پر ہمارے یہاں بھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ بہتر ماحول اور بڑی سکرین پر اچھی فلم کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے جس کا تجربہ مجھے اگلے دن ہوا۔

انڈین سٹر کے ڈائیگ ہال میں ناشتے کا انتفار کرتے ہوئے میری نظر ایک شناساچھرے پر پڑی جو کچھ یورپین لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد نظر میں تو چاروں طرف ایک خوبصورت دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ خالد حسن تھے۔ انگریزی صحافت کا ایک بڑا نام اور ایک عمده لکھاری جن سے ملاقاتیں یوں تو تیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں لیکن وہ سب کی سب سمجھی مختصر یا اتنی بھاگ دوڑ کے دوران تھیں کہ ان کا حاصل گوروں کے آداب کے مطابق موسم کے حال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سو آج پھیلی بار کچھ باہمی ڈچپی کے امور پر بات کرنے کا موقع ملا اس دوران میں وہ زیادہ عرصہ پاکستان سے باہر رہے تھے مگر مجھے یہ جان کر خوشنگوار حیرت ہوئی کہ شعر و ادب اور ڈرامے کے بارے میں ان کی معلومات بہت مفصل اپنے نوٹس اور اعلیٰ درجے کی تھیں جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ آج کل میں اپنے ایک دوست

چوہدری یونس کے ساتھ ایک ایسے میوزک البم پر کام کر رہا ہوں جس کی تمام کمپوزیشنز فوک یا کالائیکل بنیادوں پر استوار ہیں اور جن میں ایک بھی الیکٹرانک ساز استعمال نہیں کیا گیا تو وہ نہ صرف بہت خوش اور متاثر ہوئے بلکہ بہت دیر تک کریڈ کر مجھ سے اس کی تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ اس دوران میں جاوید جبار بھی آگئے اگرچہ وہ دوبار واقعی وزیر بھی رہے لیکن ان کا اصل تعارف اب بھی میڈیا ایڈورنائزرنگ اور سماجی بہبود کا شعبہ ہے۔ دونوں حضرات اپنے اپنے میدان کے ماہر بھی ہیں اور خوش گفتار بھی سو گفتگو کا موضوع ہر پانچ منٹ بعد تبدیل ہونے کے باوجود مغلل ایسی بھی کر لطف آگیا اس دوران میں بہت سے لفظی بھی درمیان سے گزرے جو سب سے مزے کا تھا وہ آپ کی نذر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے صدر عام طور پر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر کی دنیا کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات اکثر اوقات عام امریکیوں کی طرح انتہائی ناقص ہوتی ہیں۔ سو ہوا یوں کہ جارج بیش کا انتقال ہو گیا جب وہ اگلے جہان پہنچا تو داخلی دروازے پر سینٹ پیٹر نے اسے روکا اور پوچھا کہ تم کون ہو۔ بیش بہت جز بز ہوا اور بولا کہ تم مجھے نہیں جانتے، میں امریکہ کا صدر ہوں جارج بیش۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں دنیا وی درجے اور تعارف نہیں چلتے اور ہر آنے والے کو اپنی شناخت کروانی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصے پہلے پکاسو آیا اس نے بتایا کہ وہ مصور ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے فن کے نمونے دکھائے سو اس نے ایک تصویر بنا کر دکھائی اور اسے داخلہ مل گیا۔ پھر آئن آیا اس نے کہا میں سائنس و ان ہوں اور میں نے دنیا کو کوئی تم کی تھیوری دی ہے۔ استفار پر اس نے اپنی تھیوری کیوضاحت کی اور اس کی بات مان لی گئی۔ بیش نے کہا باقی بات میں بعد میں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ کہ پکاسو اور آئن سائنس کون لوگ ہیں۔

سینٹ پیٹر نے چند لمحے سوچا اور پھر دروازہ کھول کر کہا، تم اندر جاسکتے ہو کیونکہ تمہاری معلومات سے ثابت ہو گیا ہے کہ تم واقعی امریکہ کے صدر ہو۔

۲۰ مارچ کا نفرنس کا اختتامی دن تھا اور آخری اجلاس کی صدارت مجھے کرنا تھی۔ اس صدارت کا واحد فائدہ یہ تھا کہ میں وہ مقالہ لکھنے سے بچ گیا، وقت کی کمی کی وجہ سے۔۔۔۔۔ جس کا خلاصہ کر کے سنا پڑتا تھا جو بہر حال کوئی ایسا اچھا تجربہ نہیں تھا کہ اس سے بات کچھ آدھا تیر آدھا بیش جیسی ہو جاتی تھی۔ ہم سے پہلا یعنی سینٹ لاست اجلاس امریکہ میں اردو صحافت کے بارے میں تھا۔ پہلے مقرر اردو ناٹر وائل الرحمن تھے جو بظاہر ایک مرنجاں مرنج، خوش باش، دلچسپ اور موڈی سے آدمی ہیں لیکن جس طرح سے انہوں نے مسلسل محنت کے ذریعے سے اپنے آپ کو اور اردو ناٹر کو مسحکم کیا ہے اس سے ان کی دورانی دشی، تنظیمی صلاحیت اور مستقل مزاجی بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ بیشتر قارئین کے لیے یہ بات شاید حیرت اور دلچسپی کا باعث ہو کہ امریکہ اور کینیڈا میں ایک دوستیں اس سے قطع نظر اردو اخبار اور رسائلے

مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ایشیائی ہوٹلوں اور شورز پر ان کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور سرمد مفت نظر کی طرح ان کی کوئی قیمت نہیں بلکہ چشم خریدار پر کوئی احسان بھی نہیں ہوتا یہ اخبارات اور رسائل مقامی اشتہارات سے چلتے ہیں اور ان کے پڑھنے جانے کی بنیادی وجہ اپنے وطن، زبان اور تہذیب سے دوری کا وہ احساس ہے جو غیر ملکوں میں اپنے کسی بھی ہم وطن کو کیجھ کر جاگ المحتا ہے کہ بقول شخصی آدمی وطن سے نکل جاتا ہے وطن آدمی کے اندر سے کبھی نہیں نکلتا۔

خلیل الرحمن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اردو نائمز کے ذریعے ایک مشغفے کو پیشے کی شکل دے دی اور اب یہ اخبار امریکہ کی چودہ ریاستوں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے اور کینیڈا کے بعد اب انگلستان بھی اس کی زلفوں کا اسیر ہونے والا ہے۔ عمومی طور پر ان اخبارات کے مالکان کا مقصد ادب اور صحفت کی خدمت کے بجائے محض صفحے بھرنا ہوتا ہے تاکہ اشتہاروں سے بچنے والی جگہ پر کی جاسکے اور دوسرے یوں کہ یار لوگ اسے اپنے ذاتی تعصبات اور پسلی کا ذریعہ بنانا کراس کی سطح اس حد تک گردیتے ہیں کہ اخلاقیات کے تمام معیار ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اگرچہ اردو نائمز بھی توجہ اور مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر مختلف جھنڈے استعمال کرتا ہے لیکن اس نے ایک قابل قبول اخلاقی معیار ضرور قائم کر رکھا ہے سواس حوالے سے خلیل الرحمن کو اپنی صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر پہنچنے کیوں اس نے سارے شماں امریکہ کے اخبارات کی طرف سے وضاحت کی ذمہ داری انجامی اور بڑے جذباتی انداز میں اس بات پر زور دیا کہ وہاں کی صحفت پر گالی گلوچ، کردار کشی اور گھنیازیاں کا الزام سرا سر غلط ہے۔ عین مکن ہے کہ اس کی وجہ تھی عابدی کی پہلے دن کی وہ گفتگو ہو جس میں اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا اور جسے غلطی سے خلیل الرحمن نے اردو نائمز پر تقدیم کیا۔ بہر حال صورت حال اس وقت بہت محکمیر ہو گئی جب لاس انجلس اور امریکیوں کی زبان میں ویسٹ کوٹ سے آئے ہوئے شاعر فتح شہزادے مقامی اختلافات پر تھی ایک انتہائی جذباتی تقریر کی جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ خلیل الرحمن کو پورے شماں امریکہ کی وکالت کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور یہ کہ گڑ بڑے ضرور مگر ان کی طرف نہیں ہے چونکہ یہ گرامری اس کا نفرنس میں پہلی بار پیدا ہوئی تھی اس لیے حاضرین کی وجہ پر ایک دم اضافہ ہو گیا مگر کسی کی سمجھی میں نہیں آ رہا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے یعنی استغاثہ کے بغیر ہی وکیلان صفائی باہم درست و گریبان ہو رہے تھے۔ سو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ موضوع کے بجائے فرحت شہزادی کی بغیر بازوؤں والی شرث پر تبصرے کرنے لگے کہ ان کے خیال میں یہ لباس شاید کسی اور تقریب کے لیے زیادہ موزوں تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کے لیے بھی یہ صورت حال خاصی غیر متوقع تھی چنانچہ وہ قدرے دیر سے بحث میں شامل ہوئے مگر ان کی خوش گفتاری بھی فضا کی بلند آہنگی کو اعتدال پر نہ لاسکی اس پر مجھے شکر کا ایک کھیل "Much a do for Nothing" بہت یاد آیا۔

اس کے بعد ہمارے والا یعنی آخری سیشن تھا جس میں خلیجی ریاستوں میں اردو کی صورت حال پر گفتگو تو ہوئی مگر اختلافات کی کوئی خلیج پیدا نہ ہو سکی۔ بھرین کے بزرگ شاعر سعید قیس، دوہنی کے فی وی پر وڈیوس اور عالمی مشاعروں کے منتظم مرحوم سلمیم جعفری اور عالمی ادبی ایوارڈ اور مشاعروں والی مجلس فروع اردو ادب دوحة قطر کے ملک مصیب الرحمن اور محمد عتیق صاحبان کی خدمات کو سب نے سراہا کے ان لوگوں نے اس صحرائے ادبی حوالے سے مختلطان بتا دیا ہے۔

شاعر بیں اعیاز کا تعلق مکمل سے ہے جہاں سے وہ ادبی رسالہ ”اثراء“ باقاعدگی سے تکالیف ہیں اور ”نقوش“ والے محمد طفیل کی طرح اتنے خاص نمبر نکالتے ہیں کہ عام شمارہ کبھی کبھی شائع ہوتا ہے۔ کافرنس کے اختتامی جملے کے بعد اسی ہال میں انشاء کے گوپی چند نارنگ نمبر کی تقریب اجراء تھی جس میں صاحب نمبر اور مدیر و مرتب دونوں کی خدمات کو خوب سراہا گیا۔ نظامت نور جہاں ثروت نے کی بہت سے احباب نے نثر میں اور کچھ شعراء نے نظم کی شکل میں اظہار خیال کیا ان میں مخور سعیدی اور رفعت سروش جیسے معروف ناموں کے ساتھ ساتھ چند رہنمای خیال اور متنیں امر و ہوی بھی شامل تھے۔ متنیں صاحب نے غالب کے ایک مصری کی تصمین کے حوالے سے جو نظم پڑھی اسے سن کر مجھے چند برس پہلے کشمیر سٹورنٹ نیو یارک میں ہونے والی ایک تقریب بہت یاد آئی۔ ہوا یوں کہ برادرم خالد شاہین بٹ نے جو کہیں پڑھیں صاحب کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ میرے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا، خاصے لوگ جمع ہوئے جن میں ایک بہت طرح دار خاتون بھی تھیں۔

معلوم ہوا کہ ان کا تعلق حیدر آباد کن کے کسی اہم سیاسی خاندان سے ہے۔ پی انج ڈی ہیں اور فرقہ اور انگریزی میں لکھتی ہیں وہ بالکل میرے سامنے کی نشت پر بیٹھی تھیں اور ایسی لگاؤث اور تو ج کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے ان سے برسوں کی دوستی ہو یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو گئی جب انہوں نے سچ پر مجھے ایک چٹ بھجوائی جس میں درج تھا کہ میں نے آپ پر ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے اور پڑھنا چاہتی ہوں میں نے چٹ سچ سکر ٹری کی طرف بڑھا دی اور گھبرا کر نظریں جھکالیں کہاب ان خاتون کے ساتھ سارا مجمع بھی میری طرف دیکھ رہا تھا (کم از کم مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا) خیر کچھ دیر بعد انہیں سچ پر بلا یا گیا وہ قیامت کے فتنے کے انداز میں اپنی جگہ سے انھیں اور دلوں پر قدم رکھتی ہوئی مانیک پر آئیں اور بہت برطانوی تلفظ کے ساتھ ایک ایسی نظم پڑھی جس میں میرے لیے بہت اچھے لفظ استعمال کئے گئے تھے میں ابھی اس ماحول کے سر میں گھرا ہوا تھا کہ کہیں شاہین بٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

”سر جی، زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں یہ عورت اس سے پہلے یہی نظم چھ مختلف آدمیوں کے بارے میں پڑھ چکی ہے۔“
اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ متنیں امر و ہوی بھی اپنی یہی تصمین گزشتہ برس مجھے میرے لیے خاص طور پر لکھی گئی کہہ کر سنا چکے تھے لیکن

ان دو ایک سی باتوں میں جو فرق ہے وہ یقیناً اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

دہلی میں بہت سی آبادیاں "باغ" کے نام سے ہیں جن میں سب سے مشہور قروں باغ ہے۔ عازم گرونڈر سنگھ کو ہی پنجاب باغ میں رہتا ہے اس نے مجھے بتایا کہ یہ آبادی تقسیم کے فوراً بعد تھی اور اس میں زیادہ تر پنجاب کے شرناہی آبادیں۔ عازم کے ول کی طرح اس کا گھر بھی بڑا ہے اور وہ مہمان نوازی میں بھی کوئی سرنپیں انعام رکھتا ہے اس کے گھر میں داخل ہونا اور وہاں سے باہر نکلا اپنی جگہ پر ایک امتحان ہے کہ اس نے ایک دونپیس پورے چار کتے پال رکھے ہیں اور وہ بھی مختلف سائز اور نسلوں کے۔ سب سے بڑے کا نام رسکن اور چھوٹے والے کا براؤس ہے۔ یہ نام سن کر مجھے اپنے ڈرامے "وارث" کا ستارہ کریشل یاد آگیا کہ بقول چودھری حشمت "کتوں کے نام رکھنا تو کوئی انگریز سے سیکھے، یوں تو میں نہ آج تک کوئی بھی جانور نہیں پا لے اگر کتوں سے تو مجھے باقاعدہ بھسخ ہوتی ہے۔

کانٹے رتے جیں اہل درد کو

اور کیا سگ خدمت دنیا کریں

یا اور بات ہے کہ کتا کاٹے تو چودہ نیکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن انسان کا کاٹا ہے کہتے ہیں ایک بڑھایا کو پاگل کتے نے کاٹ لیا ڈاکٹر نے علاج شروع کیا۔ شام کو بڑا ڈاکٹر راؤ نڈپر آیا تو زسون نے بتایا کہ بڑھائی سے مسلسل کچھ لکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا یہ آپ کیا لکھ رہی ہیں ۔۔۔۔۔۔ کوئی وصیت وغیرہ؟

”بھی نہیں“ بڑھیا نے قلم رو کے بغیر کہا۔ ”میں تو ان لوگوں کی فہرست بنارہی ہوں جنہیں پاگل ہو جانے کی شکل میں‘ میں نے کاشنا ہے۔“

عازم کے تین کتے تو گھر سے باہر رہتے ہیں سوانحیں تو باندھ یا پکڑ کر ہمارے داخلے کی صورت نکل آئی تھی مگر چھوٹے والا جس کا نام میں نے سپا کل چھوٹو رکھا ہوا تھا پورے گھر کی آنکھوں کا تار اتحاد و طبیعتاً بہت محلی واقع ہوا ہے چنانچہ اپنے آقاوں سے بڑھ کر حق میز بانی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مہمانوں کو ایک پل تھا نہیں چھوڑتا۔ حیرت ہے کہ فردوس جو عام طور پر کتوں سے بہت ڈرتی ہے بروٹس سے بہت جلد انوس ہو گئی اور مجھے ٹیکسپیری کی زبان میں کہتا پڑا کہ

Yet Brutas was an honourable dog.

خیر یہ تو ایک تفہن کی بات تھی کیونکہ اگر غور کیا جائے تو اس جانور کی عادت والے انسان آپ کو قدم قدم پر مل جائیں گے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے کام کا کوئی علاج بھی تک دریافت نہیں ہوا۔ عازم کی بڑی بیٹی منیت عرف ہبہنا (جس کا نام شیریں بھی ہے جو عازم کی مہنگا کارکھا ہوا ہے جو ایران میں رہتی ہے) کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ سفر کے احوال "سات دن" میں کیا تھا اس دوران میں اس کی

سکائی ہو گئی اور وہ اس برس ۲۳ دسمبر کو پیاسا گھر سدھا رجاءے گی۔ کسی نے کہا تھا کہ سکھوں کے بچے بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر پھر بڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہبھیں کامنگٹر بڑا ہو جانے کے باوجود بہت سارث اور وجہہ ہے البتہ اپنی دہن کے پاتو براؤس کے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہی نہیں ہو سکی گا لیا وہ بھی بھی کہہ گا کہ

I love thou, I love thy dog

خواتین کو شاپنگ کے لیے بیچج کر ہم دونوں فلم "بلیک" دیکھنے کل گئے۔ اس کی وہاں بہت دھوم تھی۔ فلم ایک چھوٹے سینما گھر میں جنمیں ملٹی پلیکس کہا جاتا ہے لگی ہوئی تھی۔ سناء اب پاکستان میں بھی اس طرح کے سینما گھر بن رہے ہیں کہ کسی بڑے شاپنگ مال میں دو ڈھانی سوسیٹوں والے کچھ ہال ساتھ ساتھ بنا دیے جاتے ہیں جن میں مختلف فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ سینما کا اندر وہی ماحول بہت اچھا تھا۔ عمدہ میشیں شاندار سکرین اور بہترین ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ فلم دیکھنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے اس سے قطع نظر کہ ڈائریکٹر اور ائٹرنے رانی نکھرجی کے کردار میں تنوں اور شدت پیدا کرنے کے لیے اسے بیک وقت بہرا گونگا اور اندر حدا اور ذہنی طور پر غیر متوازن بنادیا تھا اور اس کے ساتھ فلمی لاسنس لیتے ہوئے ایتا بھپن کو اندر ہے کے ساتھ ساتھ گو گئے بہروں کی زبان میں باتیں کرتے دکھایا گیا تھا یعنی وہ سکھوں کے اشاروں اور آواز کے ذریعے رانی سے بات چیت کرتا تھا جبکہ وہ نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی لیکن اس مجبوری سے قطع نظر یہ ایک لا جواب فلم تھی۔ ایتا بھپن اور رانی نکھرجی کی ادا کاری تو توقع کے مطابق عمدہ تھی ہی مگر رانی کے بھپن کا کردار کرنے والی بھپن نے کمال کر دیا۔ کہیں کہیں تو وہ ایتا بھپن سے زیادہ سین پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں نئی اور اچھی بات کہنے کرنے کی محنجاش ہے جس کی وجہ سے تمام تر عربی زدہ گلیسر کے باوجود چند ایک اچھی فلمیں ہر سال بن ہی جاتی ہیں۔ اس فلم کے ڈائریکٹر بنجے لیلام بھنسالی نے پچھلے برس "دیو داوس" بنائی تھی جو ایک بہت مہنگی اور شاندار فلم تھی جس میں حقیقت اور Fantasy کو زبردست کر شل انداز میں پیش کیا گیا تھا جبکہ "بلیک" بغیر کسی گانے اور گلیسر کے اپنی جگہ پر ایک موثر اور زبردست فلم ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر ایک بار پھر خیال آیا کہ ہم ایسا کام کیوں نہیں کرتے۔

بھارت جا کر "تاج محل" نہ دیکھنا بڑی بدذوقی کی بات ہے (ویز انہ ہو تو بات دوسری ہے) ۲۲ مارچ کا دن اس کے لیے پہلے سے طے تھا۔ سڑک بہتر حالات میں تھی اور ڈیک زیادہ نہیں تھی۔ سوتقری پاچار گھنٹے میں ہم لوگ آگرہ پہنچ گئے۔ صوفیا کے مزاروں کی طرح ان تاریخی مقامات کا بھی ایک اپنا کلپھر ہے کہ ان پر مختلف طرح کے مافیا زے قبضہ کر رکھا ہے۔ مقامی فونوگرافروں اور انتظامیہ کی ملی بھگت سے سیاحوں کو موبائل کیسرہ اور مودوی کیسرہ اندر لے جانے سے روکا جاتا ہے حالانکہ ان تینوں چیزوں کا تاج محل کی سکیورٹی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ مقامی اور سیاحوں کے داخلہ ٹکٹ میں اتنا زیادہ فرق کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ تو سیاحوں کا سراسر استھان ہے کہ انہیں

”تاج محل“ کی خوبصورتی اور دبدبہ کچھ ایسا ہے کہ اس پر بات کرتے وقت عام طور پر خیال ہی نہیں آتا کہ یہ اصل میں ایک مقبرہ ہے۔ لہجی وجہ ہے کہ شاعر اس کے متعلق ایسی ایسی رومانی اور انقلابی باتی کرتے ہیں جن سے کم از کم ”قبر“ کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شاعر فرماتے ہیں۔

یہ الگ بات کہ شرمندہ تغیر نہ ہوں
ورسہ ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں
اور ساحر لدھیانوی کی وظفہ تو کسی تعارف کی محتاج نہیں، جس میں وہ کہتا ہے۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غربیوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
سوان ملے چلنے خیالات کے بھوم میں جب ہم لوگ یعنی عازم کو بھلی میتا کو بھلی اور میں اور میری بیگم آگرہ پہنچ
گذمہ سے ہو گئے۔ ایک طرف اکبر کا مزار آگرے کا قلعہ اور تاج محل تھے دوسری طرف تیسری دنیا کے ایک پر
بام اور تیسری طرف سائیکل رکشا میں بیٹھے ہوئے ایک آدم زاد کے ذہن کے کچھ اندر یہ شہر ہائے دور و دوراً!

تاج محل کو اگر عجیبا سبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے تو یہ کوئے بحث طلب بات نہیں کہ فن تعمیر کا ایسا شاہکار زمین کے تختہ پر شاید ہی کوئی ہو اور اس کا حسن تناسب اور نقشہ کچھ ایسا ہے کہ انسانی عقل و رطحیت میں پڑ جاتی ہے۔ تین سو برس پہلے کے زمانے اور سہولیات کو ذہن میں رکھیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسی عظیم عمارت کیسے سوچی اور تعمیر کی گئی۔ مغل فن تعمیر کی روایت کے مطابق اس کی حدود میں داخل ہونے کے لیے نگ سرخ سے بننے ہوئے ایک بہت بڑے ڈیوڑھی نماد روازے سے گزرتے ہیں تو عین سامنے وہ جھروکا سانظر آتا ہے جہاں متاز محل فن ہے اور دل سے بے اختیار اس فنکار کے لیے دا لفکتی ہے جس نے اس کو جیو میز ریکل ڈرائیکٹ بنائی اور پھر اس تصور کو حقیقت کی شکل دی تھی۔ ابتدائی کارروائی کے طور پر ایک چالاک فوٹو گرافر سے تصویریں بنوائی گئیں جن کے پرنسٹ ہمیں ایک گھنٹے میں تیار ملنے تھے۔ ”چالاک“ میں نے اس لیے کہا کہ فوٹو گرافروں کے ایک بہت بڑے ہجوم میں وہ ہمیں اپنی ہمدردی کا قابل کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ

ان میں ایک سے ایک چرب زبان پڑا تھا۔ موسم قدرے گرم تھا اور سر زکوہی اپنے گھنٹوں کی تکلیف کی وجہ سے سیر ہیاں چڑھنے سے گریز اٹھی۔ سوٹے پایا کہ عازم ان کو کچھی دے اور ہم دونوں میاں بیوی ساری عمارت کا راؤنڈ لگائیں۔ جو کوئی بہت محض بھی نہیں تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے برس پہلی سیر ہیاں چڑھنے کے بعد باسیں ہاتھ کی طرف پکھ لوگ جو توں کے غلاف لیے بیٹھے تھے جو جو توں پر چڑھا دیئے جاتے تاکہ عمارت کا فرش صاف سترہ رہے۔ میری نظر چوک گئی اور میں انہیں نہ دیکھ ساک اور ہم نے باقی لوگوں کی طرح جوتے اتار کر دیوار کے ساتھ رکھ دیئے جہاں بلا مبالغہ سینکڑوں جوتے رکھتے تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کرنا چاہیے مگر مرکزی عمارت کو دیکھنے کی جلدی کچھ ایسی تھی کہ ہم نے اس طرف زیادہ توجہ نہ کی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا لیکن اس کا ذکر مناسب وقت پر ہوگا؛ ابھی سے یہ بتانے کا کیا فائدہ کہ واپسی پر فردوس کے نئے اور پسندیدہ جوتے وہاں نہیں تھے۔

کتابیوں اور گائیڈوں کی باتوں سے پڑتے چلتا ہے کہ یہ عمارت صرف ”ایک قبر“ کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی اور شاہ جہاں نے اپنے لیے کچھ فاصلے پر جمنا کے دوسرے کنارے سنگ سیاہ سے ایک ایسا ہی مقبرہ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا جس کی بنیاد اس کے دورافتہ ارمیں ہی رکھ دی گئی تھی لیکن اس کے بیٹھے اور انگریز عالمگیر نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور باپ کو ماں کے پہلو میں ہی دفن کر دیا جس سے اس بے مثال عمارت کے جمالیاتی حسن کو یقیناً نقصان پہنچا کر اس کا نقشہ صرف ایک قبر کو منظر کے کر کے بنایا گیا تھا لیکن جہاں خون کے رشتے بے معنی ہو جائیں وہاں جمالیات کی کون پرداز کرتا ہے۔

مرکزی عمارت کی سطح زمین میں سے تقریباً اسی فٹ بلدر کھی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف عمارت کے پیچھے کی کوئی چیز اس کے نظارے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ اعتبار سے مختلف منفرداً اور علیحدہ بھی نظر آتی ہے اس کی چمک دمک سنگ تراشی جالیوں کی بناؤٹ، ہنرمندی اور زیب زینت کے لیے بنائے گئے نقش و نگار اور عربی خطاطی کے کملات ایسے ہیں کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کر جا ایں جاست

جو تی چوری کے تجربے سے محفوظ ہونے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے ایک گھا کے قلعے پر لیٹ گیا اور زمان و مکاں کی اس شعبدہ گری میں پھر سے گم ہو گیا جو مجھے ہمیشہ مسحور رکھتی ہے۔ یہ تصور کہ ہم سے پہلے یہاں سے کیا کیا لوگ کب کب گزرے تھے، ان ہواوں میں ہم سے پہلے جن لوگوں نے سانس لیا تھا وہ ہمارے اندر کیسے در آتے ہیں، کیوں ہمیں کبھی نہ دیکھی ہوئی جگہیں مانوں لگتی ہیں اور گزر اوقت کیسے ہمیں پھر سے گزرتا ہو احساس ہوتا ہے۔

نہ جانے کب تھا کہاں تھا، مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کہیں گزارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نہ جانے ہم ہیں دو بارا کہ یہ دو بارا ہے!

کچھ دیر بعد ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں وہجی نیبل پیزا کھاتے ہوئے دنیا پھر اپنی جگہ پرواپس آچکی تھی اپنی اپنی تھکن اور مجبور یاں پہنچنے ہوئے لوگ چاروں طرف آ جا رہے تھے اور لفٹگواصل تاج محل کے جمال سے نکل کر اس موضوع کے گرد گھوم رہی تھی کہ سونو نیز کے طور پر بنائے جانے والے اس کے ماؤں کہاں سے بہتر اور سستے ملتے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے مجھے گزشتہ سفر کا گایہ رائے زادہ اور شریک سفر ڈاکٹر تقاضی عابدی بھی بہت یاد آئے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ کہیں آس پاس ہی ہوں مگر کیلئے راہ اور گھر یاں کچھ اور ہی بتا رہی تھیں، ایک بے نام ہی اداہی کے سامنے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ میں وہاں موجود تو تھا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذات کا کچھ حصہ کہیں اور رہ گیا ہو۔ وہ علاقہ کون سا ہے؟ ماضی ہے یا مستقبل۔۔۔۔۔ جو نسل در نسل اور زمانہ در زمانہ ہماری طرح اس کائنات میں محو سفر ہے یہاں آ کر سارے علوم رک جاتے ہیں اور صرف غالب کا یہ مصر عہدوں بجا رہ جاتا ہے کہ
میری رفتار سے بھاگے ہے یہاں مجھ سے

ایک امریکن سیاح یورپ کے سفر پر نکلا تو قابل دیداری تھی مقامات کی ایک طویل فہرست اس کے ساتھ تھی جسے اس نے کچھ اس طرح سے بھگتا یا کہ جب پیرس میں دریائے سین کے کنارے اس کے ٹورست گائیڈ نے بس روکائی اور اعلان کیا کہ اس وقت ہم مشہور تاریخی دریا یا سین کے کنارے پر کھڑے ہیں تو امریکی سیاح نے بس کی کھڑکی سے دریا پر ایک نظر ڈالی اور اپنی فہرست میں دریائے سین پر لکیر پھیرتے ہوئے کہا۔

Oh, it is river sane, ok, seen.

لیکن نہ تو ہم طبعاً امریکی سیاح تھے اور نہ تاج محل دریائے سین سو ہم اس خوشنگوار تجربے سے ”لذیذ بودھ کایت در از تر گفتمن“ کی طرح گزرے۔ عازم کوہلی کے کسی دوست کے فارم ہاؤس پر ایک ذر تھا جس کی خاص بات راجستان کی مخصوص گائیکی کے نامانندہ فنکار ”لانگا“ گروپ کی پرفارمنٹس تھی۔ میزانوں نے ہم میاں یوں کوہلی دعوت دی جو ہم نے اس لیے بلا توقف قبول کر لی کہ اس کے ذریعے وہاں کے کلپنے سے تعارف کے ساتھ ساتھ ”حسن ساعت“ کا موقع بھی نکل رہا تھا۔

فارم ہاؤس اپنے مکینوں کے تمول اور حسن ذوق کا نامانندہ تھا۔ معلوم ہوا کہ اس دعوت میں ”ہولی“ کے استقبال کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ وسیع لان میں ایک طرف مکولات اور دوسری طرف مشروبات کے سالز تھے۔ ایک او چھڑ عمر کی خوش نما اور انتہائی بنس کھنڈ خاتون ہر کام میں آگئی آگئی تھی۔

عازم نے بتایا کہ یہ جرل بھجیت سنگھ ارڈری کی بیٹی ہے۔ ایک دن ڈہن میں گھنٹی بھی اور سقوط ڈھا کہ مشرقی پاکستان، پلن میدان ڈھا کہ اور جرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے مناظر نیون سائنس کی طرح حافظے میں جلنے بھجنے لگے۔ کچھ لمحے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس اطلاع پر میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ عازم کو بھی میری ذہنی حالت سے بے خبر اس خاتون کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور اس کا مرض خاصی ایڈ و انس سٹیج پر ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کو انتہائی خوش دلی اور بہادری سے جی رہی ہے اور یہاں بھی مہمان ہوتے ہوئے میزبانوں سے زیادہ سرگرم ہے۔ کچھ دیر بعد اس خاتون نے مائیک پر آ کر بڑی عمدہ انگریزی ملی اردو میں مہمانوں کا سو اگٹ کیا اور راجستھانی موسیقی کے حوالے سے آج کے موسیقاروں کا تعارف کروایا یہ فنکار بڑے سیدھے سادھے اور نیم دیہاتی سی لوگ تھے۔

ان کے لیڈر محمد علی لانگا نے اپنی ثوٹی پھوٹی زبان میں اپنے گروپ اور ان آئنہ کا تعارف کروایا جو وہ پیش کرنے والے تھے اور پھر بڑی سادگی سے یکدم گانا شروع کر دیا۔ اکثر آئنہ کو سننے کے دوران حافظے میں انڈیں فلموں کے کچھ بہت عمدہ اور یادگار گانے یاد سے آ کر رہ جاتے تھے لیکن جب انہوں نے ”کیسرا یا بالا“ شروع کیا تو برادرم گلزار کی فلم ”لیکن“ جیسے سامنے چلانا شروع ہو گئی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ راجستھانی موسیقی سے گلزار کو بے حد پچھپی ہے اور وہ اکثر ویژت اس کی وہنوں کو اپنے گانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ محفل اپنے اختتام کے قریب تھی اور کھانا کھلنے ہی والا تھا کہ یکدم انہوں نے میرا لکھا ہوا ایک گیت ”لگن لاگی من کی لگن“ گانا شروع کر دیا جو میں نے مرحوم نصرت فتح علی خان کے لیے لکھا تھا اور جوان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے راحت فتح علی خان نے صرف ریکارڈ کرایا تھا بلکہ اسے بھیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ نے اپنی فلم ”پاپ“ میں بطور نمائی سائیگ بھی استعمال کیا تھا۔ میں اس خوشنگوار اتفاق سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ عازم کے ذریعے انہیں اردو ڈھا کہ اور پھر گانے والوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ اس گیت کے لکھیک اس محفل میں موجود ہیں۔ سواس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور گیت کوئی بارستا گیا۔ آخر میں فنکاروں نے آکر اپنے مخصوص انداز میں میرے پاؤں چھوئے اور حاضرین نے کم و بیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ نے تعریفی کلمات کہے۔ فن اور فنکاروں کی اس قدر افرادی سے بے اختیار ڈہن اپنے معاشرے کی طرف گیا جہاں سرکاری طور پر موسیقی سے متعلق لوگوں کو اب بھی ”اربابِ نشاط“ کہا جاتا ہے جس کا مہذب ترین انگریزی متبادل Entertainer ہے اور جہاں اصل اور موذن جانتے والے فنکاروں کو عزت تو کیا دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ بہت برس پہلے ایک بار میں نے برادرم خالد آفتاب کے گھر پر مشہور لوک گلوکار طفیل نیازی مرحوم سے انڈیا اور پاکستان کے شفاقتی رویوں کا فرق دریافت کیا تھا اور اس کا جملہ آج بھی مجھے ادا کر دیتا ہے اس نے کہا تھا۔

”سرکار اثاثی اور واگہہ کے درمیان صرف دوسو گز کا فاصلہ ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ اثاثی کے بارڈر پر لوگ ہمیں عظیم فنکار اور بھگوان کہہ کر

بلاتے ہیں اور واگہ کر اس کرتے ہیں ہم میراٹی اور بجانڈ بنا دیئے جاتے ہیں۔“

جس طرح ہمارے ہاں پی آئی اے کے ساتھ اب کچھ بھی کپنیاں بھی ہوائی سروں کے شعبے میں کام کر رہی ہیں اس طرح انڈیا میں بھی سرکاری ائیر لائنز "ایئر انڈیا" اور "انڈین ائیر لائنس" کی اجاری داری ختم ہو گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں پر ایسویت ائیر لائنز تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں اور ان میں سے کئی ایک خاصی بڑی بلکہ بہت بڑی ہیں اور ان کا ستم بھی یورپ اور امریکہ جیسا ہے کہ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ آئے دن نئے سے نئے تکچک نکلتی رہتی ہیں۔ ہمیں بھی جیٹ ائیر لائنس کا ایک ایسا ہی پنج مل گیا جس کے نتیجے میں سولہ سے اٹھاڑہ ہزار والی تک دس ہزار میں مل گئی۔ پچھلی بار میں نے انڈین ائیر لائنز پر سفر کیا تھا جس کی یادیں کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھیں لیکن جیٹ ائیر لائنز کا جہاز اور عملہ دونوں بہتر تھے یہ اور بات ہے کہ بیگم کی موجودگی کے باعث عملے پر زیادہ توجہ دینا ممکن نہ تھا۔ ممکنی ائیر پورٹ پر سلیم عارف منتظر ہوڑے تھے۔

گزشتہ بارہ برسوں میں ان کی شہرت عمر اور جسم تینوں بڑھے اور پھیلے ہیں۔ سواب انہیں لڑکا کہنا تو قدرے مشکل ہے مگر ان کی مسکراہٹ کی اپنا بیت اور گرم جوشی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ گاڑی میں سامان رکھوانے کے دوران انہوں نے بتایا کہ گلزار صاحب کو کسی روشنین میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا تھا سو وہ ائیر پورٹ تونیں آئے مگر اس وقت ہمارے ہوٹل میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں جو کہ ساحل پر واقع ہے اور اس کا نام بھی اسی سائیڈ ہوٹل ہے جو ان کے گھر یعنی باندرہ سے کوئی بہت زیادہ دور نہیں۔

میری بیگم فردو کے ذہن میں انڈین فلموں اور قلم ایوارڈ شووز کے گلیم کے باعث انڈین اداکاروں کے گھروں اور رہائشی علاقوں کے بارے میں تصور غالباً بہت مختلف تھا چنانچہ جب سلیم عارف نے ہمارے سامنے کمن آباد جسی کی ایک آبادی میں واقع بڑے بڑے شارز کے گھروں کی نشاندہی کی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ ایتا بھچن کے نئے اور پرانے دونوں گھر ہوٹل کے قریب ہی واقع تھے مگر ان کا بیرونی منتظر بھی گلزارے لائق تھا۔ البتہ یہ اطلاع اہم تھی کہ اس کا سکیورٹی کا عملہ خاصا بڑا ہے اور پولیس کی خصوصی گارڈ بھی چوبیں لگھتے وہاں موجود رہتی ہے۔ ہوٹل کے چھوٹے سے استقبالیہ میں گلزار بھائی اپنی مخصوص خوشگوار اور بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھوں میں ایک خوبصورت گلدستہ لیے ہمارے منتظر تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اردو کا معافہ کرنے کے بجائے پنجابی کا "جھچھا" بلکہ تمہی ڈال کر ملتے ہیں۔ سو یہ خوبصورت رسم یہاں بھی نباہی گئی اور ان کے مشورے کے مطابق ہم پانچویں منزل پر واقع اپنے کمرے میں سامان رکھ کر فوراً ہی ان کے ساتھ چل پڑے کہ لمحہ کا نامم ہو چکا تھا۔ لمحہ ایک ایسے چینی ہوٹل میں کیا گیا جو باہر سے ہوٹل تو کیا، کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا لیکن اندر سے نہ صرف بہت محققوں تھا بلکہ اس کا کھانا بھی عمدہ اور خوش ذات تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کھانوں کا بھی اصل چینی کھانوں سے اتنا ہی تعلق تھا جتنے ہمارے یہاں ہوتا ہے اس پر مجھے اپنے چینی شاعر دوست چانگ چی شوان عرف انتخاب عالم کا یہ جملہ بہت یاد آیا جو اس نے ہمارے لاہور کے میکانگ

ہوٹل میں ایک دعوت کے بعد کہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ تھا یہاں چینی ہوٹلوں میں پاکستانی کھانا بھی ملتا ہے۔“

معلوم ہوا کہ کل ہوئی کے تہوار کی وجہ سے شام چار بجے ہوٹل کے کمرے سے لفنا مکن نہ ہو گا سو سوائے ٹی وی پر پاک بھارت تیرا نیٹسٹ میچ دیکھنے کے ہمارے پاس کوئی آپشن نہ ہو گا یعنی ہمارے پاس آج اور کل کی شام کے علاوہ صرف پرسوں کا دن ہے کیونکہ اس سے اگلے دن یعنی ۲۸ مارچ کی شام ہی ہماری واپسی کی فلاٹ بک ہے۔ ابھی ہم ہبھا اور میسر وقت کی جمع تفریق میں مصروف تھے کہ اختر آزاد صاحب کافون آگیا جو پہلے دن سے ہم سے رابطے میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اتنا جی یعنی لائن گلیکٹر اس وقت پونا میں ہیں اور ہماری واپسی سے قبل ان کا میمی پہنچنا مشکل ہے کیونکہ آج کل اکثر بڑے فکار ہوئی کے دنوں میں شاکین کے ہجوم اور بے جامداخلت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور اتنا جی تو ویسے بھی اب زیادہ وقت پونا میں ہی گزارتی ہیں۔ البتہ فون پر وہ خود را بطور ایک اسی کا آئندہ بخت وہ میری ایک غزل اپنی نئی سی ڈی میں ریکارڈ کرنے والی ہیں۔ فردوس کو یہ جان کر بہت مایوس ہوئی کہ اتنا بھبھن بچن اور جیا بچن بھی اس حوالے سے گوا جا چکے ہیں اور پتہ نہیں کب واپس لوٹیں گے (کہ اس پروگرام میں ان لوگوں سے مانا بھی شامل تھا) طے پایا کہ آج رات کو راج کپور کے مشہور پر تھوی تھیز میں ڈرامہ دیکھا جائے جو ہمارے ہوٹل سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے کیونکہ اس کا غالب امکان ہے کہ آئندہ دو راتوں میں شاید اس کے لیے وقت ہی نہ کل سکے۔ عدنان سعی خان سے فون پر رابطہ ہوا اس کی آواز کی گرم جوشی اور محبت بھرے لفظوں سے اندازہ ہوا کہ بے پناہ شہرت اور کامیابی کے باوجود اس کا دماغ اپنی جگہ پر ہے اور وہ ایک اچھے اور خاندانی انسان کی طرح وضع داری اور تعلقات نبھانا اور رشتہوں کی قدر کرنا جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ کل سہر اس کا ڈرائیور ہمیں ہمارے ہوٹل سے لے آئے گا اور پھر شام ہم مل کر گزاریں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے۔

سچ پلے کا نام ”جنہیں لا ہو رہیں ویکھیا“ تھا۔ سلیم عارف نے بتایا کہ یہ چند برس پہلے لا ہو رکے کسی ڈرامہ فیسلوں میں بھی کھیلا جا چکا ہے۔ اس کے ہدایت کار فلم اور سچ کے سینر ادا کارڈ نیش تھا کہ رہیں اور اس کا اپس منظر قسم ہند کے فوراً بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے متعلق ہے، جب بر صیر کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ کھیل کا مرکزی کردار ایک بوڑھی ہندو عورت تھی جو ہنگاموں کے دوران پاکستان میں واقع اپنے گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے اور یہ گھر بھارت سے آئے ہوئے ایک مسلمان مہاجر خاندان کو الات ہو جاتا ہے جو شروع میں اسے وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر پھر اسے بزرگوں جیسا سمجھنے لگتے ہیں۔ مقادلات، جہالت اور انتقام اور نیکی بدی کی ارزی کلکش میں بال آخر فتح انسانیت کی ہوتی ہے۔ کھیل ہر اعتبار سے درمیانہ درجے کا تھا مگر تھیز کا ماحول اور پیش کش کا انداز بہت خوبصورت تھے۔

عدنان سعی خان سے کوئی تمن گھنٹے کی بہت پر لطف ملاقات رہی اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں کا سپرشار ہے اور کامیابی کے چندے کے گزتا ہی چلا جا رہا ہے اس کا وزن اگرچہ پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے لیکن چہرے کی مخصوصیت اور فن سے اس کی وابستگی ایسی غیر معمولی ہے کہ دھیان اس کے تن توٹش کی طرف جاتا ہی نہیں۔ مرحوم نصرت فتح علی خان کی طرف اس کی انگلیاں بھی ساز کو چھیڑنے کے لیے بے چین رہتی ہیں سواسِ محفل میں اس نے مجھے میری ایک غزل کی کپوزیشن سنائی جو اس نے آٹھ برس قبل ایک بار لا ہور میں مجھے گھنگنا کر سنائی تھی۔ عدنان چونکہ بنیادی طور پر غزل کا انگر نہیں ہے اس لیے اسے کچھ مسائل کا سامنا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے باہمی مشوروں اور ترمیم و اضافے کے بعد جب دھن کی مطلوبہ صورت نکل آئی تو اس نے ایک بڑے مزے کی بات کہی کہنے لگا۔ ”آٹھ برس سے یہ غزل میرے ذہن میں تیار تھی لیکن میں اسے ریکارڈ نہیں کرا رہا تھا، اب میری سمجھ میں اس کی وجہ آئی ہے کہ دراصل یہ اپنی تکمیل کے لیے آج کی ملاقات کا انتخاب کر رہی تھی۔“

جاوید صدیقی کا نام سُچ ڈرامے اور فلم کے حوالے سے بہت معروف اور محترم ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اداکار راج بہر کی بیگم (جو مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کی صاحبزادی ہیں) نادرہ بہر ان کا ایک سُچ کھیل ”بیگم جان“ لا ہور کے ایک ڈرامہ فیسوں میں لے کر آئی تھیں جو مختلف حوالوں سے اخبارات میں شہرخیوں کا موضوع بھی بناتھا۔ فلموں میں چونکہ چند بڑے ستارے کے ناموں کے علاوہ باقی ٹائل اس تیزی سے گزارے جاتے ہیں جیسے کوئی ناگوار فرض پورا کیا جا رہا ہے اس لیے ممکن ہے پاکستانی ناظرین اس بات سے آگاہ نہ ہوں کہ ان کی چند بہت ہی پسندیدہ فلمیں جاوید صدیقی کی ہی لکھی ہوئی ہیں جو چند نام فوری طور پر یاد آ رہے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔۔۔ امراؤ جان ادا۔۔۔ ڈر۔۔۔ تہذیب۔۔۔ راجہ ہندوستانی۔۔۔ زبیدہ۔۔۔ جال۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صاحبزادی عزیزہ لہنی، ملیم عارف کی نصف بہتر ہیں اور ہندوستانی محاورے کے مطابق سارا خاندان فون لٹیف سے جڑا ہوا ہے۔ رات کا کھانا ان کی طرف تھا جہاں سعودی عرب سے آئی ہوئی ان کی بہن اور بھائی بھی موجود تھے۔ سو گفتگو اپنی مرضی سے ٹریک بدلتی رہی اور صورت حال کچھ کچھ ایک فلمی گانے کے مکھرے جیسے ہو گئی کہ

کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے

جاوید صدیقی ایک بہت محبت والے اور نیس انسان ہیں اور ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شہرت Deserve اور انجوائے توکرتے ہیں مگر اس کی رو میں بہنہیں جاتے اور اپنا ہر کام پوری محنت اور دیانتداری سے کرتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پروگرام بناتے کہ پر تھوی تھیز میں آج ڈینش ٹھا کر کے ایک کھیل ”ہائے میرا دل“ کا ہزارواں شو ہے سو یہ کھیل مل کر دیکھا جائے۔ ڈینش ٹھا کر کی فرماکش بھی

پوری ہو جائے گی اور ہم بھی یہ جان سکیں گے کہ بھارت میں ”مزاح“ کے نام پر کیا بلکہ کیا کیا ہو رہا ہے۔

پر تھوڑی تھیز کی کینٹین پر بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہاں ڈرامے کی روایت کتنی گہری اور مضبوط ہے۔ یہاں پر تھوڑی راج کی پوتی اور ششی کپور کی بیٹی سجنا کپور سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل اس تھیز کو چلا رہی ہے۔ فردوس نے بتایا کہ کچھ برس پہلے یہ کسی فلم میں ہیر و نبھی آئی تھی اس کے چہرے اور آنکھوں کے رنگ میں اس کی ماں جنتھر کی شباهت بہت نمایاں تھی۔ ڈرامہ سکرپٹ اور اداکاری کے اعتبار سے ٹھیک خاک تھا مگر اہم اور زیادہ خوبصورت بات اس کی مختصر اختتامی تقریب تھی جو بیک وقت انتہائی سادہ اور پر وقار تھی کہ پذیر ای کرنے اور کرانے والوں کی بنیادی الہیت صرف اور صرف فن سے کم نہ ہونا تھا۔

اگلا دن جو بھی میں ہمارے اس دورے کا آخری دن تھا، گزار صاحب کے نام تھا۔ سعید عارف کے ساتھ ہم پالی ہڑ باندرہ میں ان کے مکان ”بوسکینا“ پر پہنچے (گزار کی بیٹی میگھنا کا پیار کا نام ”بوسکی“ ہے اور اس کے نام بھی رکھا گیا ہے) تو وہ حسب معمول سفید برائق کرتے پا جائے اور کھے میں ملبوس ہمارے منتظر تھے۔ میں اس گھر میں وہ بارہ سال پہلے بھی آپ کا تھا مگر ہر چیز نئی نئی لگ رہی تھی۔ گزار نے بتایا کہ اب انہوں نے اپنا دفتر بھی بیہیں شفت کر لیا ہے جس کی وجہ سے اس علاقے کی Look تبدیل ہو گئی ہے۔ پتوں اور درختوں سے ان کی دلچسپی ہر ہر چیز سے نمایاں تھی۔ کمرے میں سکھہ ہندو اور اسلام تینوں مذاہب کی نشانیاں ساتھ ساتھ تھیں بھگوان کی مورتی، کرپاں اور چاروں ”قل“، مختلف دیواروں پر آویزاں تھے۔ سعید عارف نے بتایا کہ ایک مرحوم دوست کی یاد کے حوالے سے گزار ماه رمضان میں باقاعدگی سے کچھ روزے بھی رکھتے ہیں۔

ایک طرف دیوار پر مختلف مشہور کارٹوں کے بنائے ہوئے گزار کے کارٹوں بھی آویزاں تھے جو ان کی تخلیقی اور جدت پر مند طبیعت کے غماز تھے کہ عام طور پر لوگ اپنے کارٹوں چھپا کر رکھا کرتے ہیں۔ گلوکار ججیت سنگھ سے طے کیا تھا کہ وہ بھی گزار کی طرف آجائیں گے تاکہ اسی بہانے ملاقات کے ساتھ ساتھ مجوزہ ہی ڈی کے لیے کلام کا انتخاب بھی کیا جاسکے ان کا فون آیا کہ وہ کچھ غیر متوقع مہماںوں کی وجہ سے پھنس گئے ہیں اور کوئی دو بجے تک پہنچ سکیں گے۔ دوسری طرف ایتا بھ پچن کی سیکڑی رابطے میں تھی کہ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہو گی اور چونکہ مجوزہ وقت Clash کر رہا تھا اس لیے یہی طے پایا کہ ججیت سنگھ گزار صاحب کے مشورے سے کلام کا انتخاب کر لیں گے اور بعد میں فون اور فیکس پر ”ایجاد و قبول“ ہو جائے گا۔

ایتا بھ پچن گزشتہ تیس برس سے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ چلے آرہے ہیں۔ ان سے پہلے دلپ کمار اور بعد میں شاہ رخ خان نے بھی اس میدان میں بہت نام کیا اور اپنی اپنی جگہ پر یقیناً انہیں بھی بے مثال کہا جا سکتا ہے مگر شاید ایتا بھ پر قسم کچھ زیادہ مہربان ہے کہ بطور کریکٹر ایکٹر بھی وہ فلم کی باقی ساری کاست پر بھاری پڑتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان سے ملاقات سائز ہے تین بجے فلم

"ضمانات" کی لوکیشن پر ہوگی جس کی شوینگ گزشنا بارہ برس سے رک رک کر ہو رہی ہے کہ فلم کے ہدایت کا رو بجے ناچن اپنے پروڈیوسرز کی وجہ سے اسے مکمل نہیں کر پا رہے لیکن اس کے باوجود ایتا بھان کے کام کو افضلیت دیتے ہیں کیونکہ وجہ ناچن نے ان کی گنتائی اور سکھش کے دور میں انہیں ہیرولیا تھا اور وہ یہ احسان بھول نہیں سکتے۔ گلزار نے بتایا کہ اس دولت زده انڈسٹری میں یہ غیر معمولی انسانی رو یہ شاید ایتا بھان کے والدین کی عمدہ تربیت کے باعث ہے اور خوش کن بات یہ ہے کہ یہ تربیت ان کے پھول میں بھی منتقل ہو رہی ہے۔

ایتا بھان شوینگ کی لوکیشن پر اپنی مخصوص لگزیری کوچ استعمال کرتے ہیں (جس میں ان کا بیدر روم میک اپ روم اور با تھر روم وغیرہ خاص طور پر بنائے گئے ہیں) ہماری ملاقات بیہیں ہوتی تا کہ آسانی اور یکسوئی سے بات چیت ہو سکے۔ پاکستانی اُوی اور فلم کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں اور اردو سکرپٹ بھی چونکہ وہ آسانی سے پڑھ نہیں سکتے سو پاکستانی شاعری کا بھی انہیں کوئی خاص پڑھنیس تھا لیکن جس قدر محبت اور اخلاق سے ملے اور جس توجہ اور انہاک سے انہوں نے گفتگو میں حصہ لیا اس کا پیشتر کریڈٹ تو یقیناً گلزار ہی کو جاتا ہے کہ اصل میں وہ ہماری وساطت سے ان کی عزت کر رہے تھے جو ان کی خاندانی اور شخصی شرافت اور وضع داری کی آئینہ دار تھی لیکن میں نے محسوں کیا کہ وہ مخاطب کی بات کو غور سے سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے فن سے متعلق ہر چیزی یا نئی بات کو Pick کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جب میں نے ان کی حالیہ فلم "بیک" کے ایک سین میں ان کی ڈائیلاگ ڈیلوری کے ایک مخصوص پہلو کا ذکر کیا تو نہ صرف ان کی آنکھیں چمک انہیں بلکہ انہوں نے مختلف سوالات کر کے میرنی بات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ آپ اب تک ملنے والے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اتنی بار بکی اور تفصیل سے یہ بات نوٹ کی ہے۔ اس پر گلزار کچھ اس محبت اور بے ساختی سے مسکرائے جو صرف ان مخلص دوستوں کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جو اپنے دوستوں کی عزت تعریف اور ترقی پر خوش ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سلیم عارف نے اس موقع پر اپنے Digital کیرے سے بہت سی تصویریں بنائیں۔ فردوس اس ملاقات سے بہت خوش اور Excited تھی جس پر بعد میں گلزار نے پھر میں اسے خوب تنگ کیا۔

باہر لکھتے تو انوپم کھیر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے ہمیں اپنے موبائل پر آیا ہوا ایک ایس ایم ایس مسج دکھایا جو اس کے کسی پرستار نے ہوئی کی مبارکباد کے سلسلے میں گلزار کے مخصوص شاہل میں لکھا تھا۔ ہماری فلاٹیت کا وقت قریب آتا جا رہا تھا سوبات سلام دعا تک ہی محدود رہی۔ واپسی پر ہم نے جلدی جلدی بیٹھنے کی قیاشان اور کچھ احباب کے لیے گلزار کے ہمسائے میں واقع ایک سور سے کچھ مردانہ تمثیلیں اور نو اسیوں کے لیے کچھ کپڑے خریدے اور ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ گلزار کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے چیک ان ہونے تک ہمارے ساتھ ہی رہیں گے حالانکہ میں نے انہیں کہا بھی کہ ہمارافی الحال واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں فلاٹ کا نائم ہو گیا۔ فلاٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے خاصی نا ہموار تھی چنانچہ ولی ایئر پورٹ پر اترتے وقت ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے ہم آئے نہیں بلکہ

لائے گئے ہیں۔

اگلا دن عازم کو بھلی کی فیصلی کے ساتھ گڑگاؤں کی سیر میں اور شام اینتا اردوہ کے گھر ایک نیم ادبی محفل میں گزری اور ایک بار پھر یہ تاثر پختہ ہوا کہ وہاں کے اہل ثروت میں زیادہ تعداد مہذب، تعلیم یافتہ اور سادگی پسند لوگوں کی ہے جو دولت سے زیادہ اپنی شخصیت کو وجہ اعزاز سمجھتے ہیں۔ ولی سے لا ہو ر آتے ہوئے جہاز میں نوجوان کرکٹروں یا سرجید، توفیق عمر اور خلیل احمد سے ملاقات ہوئی جو دونوں ڈے سیریز میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے واپس جا رہے تھے۔ ان نوجوانوں سے بات کر کے خوشی ہوئی کہ شوخ طبع اور کھلاڑی ہونے کے باوجود ان کی نشست و برخاست اور بات چیت کا انداز بہت سلچھا ہوا تھا، سوانحیں دیکھ کر احمد مشتاق کا یہ شعر بہت یاد آیا کہ

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

